ماہنامہ
بیداری
حیدر آباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد
E-MAIL
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03463216078

جلد تیئیسواں◯ اکتوبر - نومبر 2025
قیمت: 25روپے، سالانہ: 300روپے

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
اہل مغرب کے بڑھتے ہوئے ذہنی ونفسیاتی مسائل	محمد موسیٰ بھٹو	۶
اعداد وشمار کی روشنی میں (مصنوعی ذہانت سے ماخوذ)		
اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کے نقصانات	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۱۶
مغربی تہذیب سے وابستہ لوگوں کی بعض خوبیاں	محمد موسیٰ بھٹو	۲۳
مغربی تہذیب		۲۵
اور اسلامی تہذیب (مختصر جائزہ)		
مغرب میں آباد مسلمانوں کے حالات	محمد موسیٰ بھٹو	۲۷
جنسی ہیجان خیزی کی نفسیات فکر مندی کی ضرورت		۲۹
وقت کے صحیح استعمال کے بنیادی اصول	سمیہ اسلام	۳۲
سنی سنائی بات کی تحقیق کرنا	تحریر مولانا عبدالمتین	۳۶
اسلام میں سادہ طرز زندگی کا تصور	تحریر: ڈاکٹر فرح ناز	۴۳
کتاب دوستی اور ہمارے اسلاف	مولانا عصمت اللہ نظامانی	۵۰
اسلاف واکابر کی تواضع کے واقعات	مفتی محمد طارق محمود	۶۰
وحی یا عقل: اسلام اور لادینیت کا تصادم	تحریر: ضمیر حسین لغاری	۶۹
ہمارے کچھ اہم معاملات	محمد موسیٰ بھٹو	۷۸
احادیث نبوی کی روشنی میں		

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

قرآن کا پیام

ہمارے نام

جس شخص سے عذاب ٹال دیا گیا

اس پر بڑا کرم فرمایا گیا

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (سورۃ الانعام آیت ۱۶) (وہ شخص جس سے اس دن عذاب ٹال دیا گیا اس پر اللہ نے بڑا رحم فرمایا یہ کھلی کامیابی ہے) آخرت کا عذاب ایسی چیز ہے، جس سے بڑھکر کوئی دکھ دینے والی تکلیف اور اذیتناک حالت نہیں ہے، بندہ مومن سب سے زیادہ اللہ کے اسی عذاب سے ڈرتا ہے، اس عذاب سے نجات کے سلسلے میں اسے اپنی زندگی بھر کے اعمال ہیچ نظر آتے ہیں، اللہ کے فضل خاص ہی سے عذاب سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ اعمال پر اعتماد نہیں، اگر اللہ کو بندے کا کوئی ایک عملِ بد ہی ناپسند ہوا تو وہ اس عمل بد کی وجہ سے عذاب کا شکار ہو سکتا ہے، اس لئے جہاں اعمال سرانجام دیتے رہنے کی ضرورت ہے، وہاں اللہ سے اس کا فضل خاص بھی مانگتے رہنا چاہئے، جن اکابر بزرگوں کو اللہ کی زیادہ معرفت حاصل رہی ہے، وہ اسی قدر اللہ کے عتاب سے ڈرتے رہے ہیں۔

جس شخص سے عذاب کو ٹال دیا گیا، جسے معافی دی گئی، وہ سب سے بڑا خوش نصیب انسان شمار ہوگا۔

دنیاوی زندگی عام طور پر فرد وافراد کو آخرت کے عذاب سے غافل کر دیتی ہے اور اس کی فکرمندی ہی موجود نہیں ہوتی، اگر موجود بھی ہوتی ہے تو تھوڑی دیر کے

لئے ہوتی ہے، پھر فرد غافل ہو جاتا ہے، اہل اللہ جنہیں اللہ کی معرفت حاصل ہے، ان پر ہر وقت یہی فکر غالب رہتی ہے۔

غفلت اور اعمال کی سزا کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، موت کے بعد جزا سزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے، قبر میں دوزخ اور جنت کے مناظر اسے دکھائی دیئے جاتے ہیں، بس اللہ ہم سب کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائے اور ہمیں اپنے عذاب سے بچائے۔

گناہوں کا مزاج پختہ ہونے سے توبہ کی طرف نہ آنا

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۷۴) (تو یہ کیوں اللہ کے آگے توبہ نہیں کرتے اور اس سے گناہوں کی معافی نہیں مانگتے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے)۔

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات بتاتی ہیں کہ اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ ہر وقت بندے کو اپنے سایہ رحمت میں لینے کے لئے تیار ہے، لیکن یہ بندے کی اپنی محرومی ہے کہ وہ رحمت و بخشش والی ذات کی طرف رجوع ہونے کے لئے تیار نہیں۔

فرد عام طور پر نفس پرستی اور مادیت پسند قوتوں کے زیر اثر رہتا ہے اور اللہ سے غفلت اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے، نیز نفس پرستی کی قوتیں اسے مسلسل گناہوں میں مصروف رکھتی ہے، جس کی وجہ سے اس کا گناہوں کا مزاج پختہ ہونے لگتا ہے، اس لئے وہ گناہوں سے معافی اور توبہ کی راہ پر آنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

عذاب کے بدلے میں سب کچھ دینے کی حسرت کا ہونا

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۳۶) (جو لوگ کافر ہیں، ان کے پاس اگر روئے زمین (کے سارے خزانے اور اس) کا سب مال ومتاع ہو اور اس کے

ساتھ اسی قدر اور بھی ہوتا تو قیامت کے روز عذاب سے (بچاؤ) کے بدلے میں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کو درد دینے والا عذاب ہوگا)۔

آخرت میں اہل کفر کی طرف سے اللہ کی سزا سے بچنے کے لئے دنیا بھر کے خزانے دینے بلکہ دگنے خزانے دینے کی آرزو اور حسرت کا ہونا، یہ بات ایسی ہے جو نافرمان بندے کو کفر سے توبہ تائب ہو کر اللہ کی طرف رجوع ہونے کے لئے اکسانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس طرح کی قرآنی آیتوں سے اگر اہل کفر متنبہ نہیں ہوتے تو ہمیں تو ان آیتوں سے عبرت حاصل کر کے اللہ کی طرف مکمل رجوع کی راہ اختیار کرنی چاہئے، اس لئے کہ گناہوں کی خاصیت بھی عذاب ہی کی ہے، اگرچہ یہ عذاب کی ہلکی صورت ہوگی کہ عذاب دے کر معاف کر دیا جائے گا، لیکن گناہوں کے نتیجے میں عذاب کا ملنا بجائے خود ایسی سزا ہے کہ فرد کے ہوش وحواس قائم نہ رہیں گے، مہلت عمل موجود ہے، گناہوں سے ہر ممکن حد تک بچنے اور اعمال کی عادت کو مستحکم کر کے ہم اپنے آپ کو اللہ کی سزا سے بچا سکتے ہیں۔

نیکی کے کاموں میں
ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی تاکید

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۱)

(نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو)۔

نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون سے نیکی کو فروغ حاصل ہوتا ہے، نیکی کو جتنا فروغ حاصل ہوگا، بُرائی کی قوتیں اسی قدر کمزور ہوں گی۔

ابلاغ کی قوت ذہنوں کو بدلنے کے سلسلے میں فیصلہ کن اہمیت اختیار کر گئی ہے، ان ذرائع سے نیکی کی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک دوسرے سے تعاون کے جذبے کا فقدان ہے، اس کا سبب گروہی اور دائراتی خولوں میں بند

ہونا ہے، ہر گروہ کی عام طور پر حالت یہ ہے کہ اس کے حلقے سے باہر خیر کا کتنا ہی بڑا اور بہتر کام کیوں نہ ہوتا ہو، لیکن وہ نہ صرف یہ کہ اس کام کو دوسروں تک پہنچانے میں تعاون نہیں کرتا، بلکہ وہ اسے کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے، جس کی وجہ سے امت کا بڑا طبقہ، اپنے حلقے سے باہر کی علمی اور دینی شخصیتوں کی فکر سے استفادہ سے بھی محروم ہے تو دوسروں کو اس کام سے متعارف کرانے سے بھی۔

ہماری یہ روش تعاونوا علی البر کے اصول کے منافی ہے، اللہ ہمیں گروہی خولوں سے نکال کر امت پن کی راہ پر لائے، تاکہ ہم امت کی علمی، فکری اور ذہین شخصیتوں کے فکر سے خود بھی استفادہ کریں اور دوسروں کو بھی اس سے استفادہ کی دعوت دیں۔

محمد موسیٰ بھٹو

اہل مغرب کے بڑھتے ہوئے ذہنی ونفسیاتی مسائل

اعداد وشمار کی روشنی میں

(مصنوعی ذہانت سے ماخوذ)

مصنوعی ذہانت جدید میڈیا میں معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ہر موضوع پر وہ معلومات فراہم کرتا ہے، ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ امریکہ اور یورپ میں شراب نوشی، نفسیاتی بیماریوں، جنس زدگی اور خاندانی نظام کی شماریاتی اعداد وشمار میں صورت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے ہمیں جو مضمون بھیجا ہے، وہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ **(ادارہ)**

یہ رپورٹ امریکہ اور یورپ میں سماجی ونفسیاتی رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا ایک جامع اور تجزیاتی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد شراب نوشی، آزاد جنسی عمل، خاندانی نظام اور نفسیاتی امراض سے متعلق دستیاب اعداد و شمار کی روشنی میں ان رجحانات کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہے۔ اس رپورٹ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ مسائل الگ تھلگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے پیچیدہ طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا باہمی ربط سمجھنا صحت عامہ اور سماجی پالیسیوں کے لیے ایک گہری اور درست بصیرت فراہم کرتا ہے، تاکہ ان چیلنجوں کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کیا جاسکے۔

باب اول: شراب نوشی کے اعداد وشمار اور اس کے سماجی وطبّی مضمرات

امریکہ اور یورپ میں شراب نوشی ایک گہرا ثقافتی اور سماجی رجحان بن چکی ہے، جس کے صحت عامہ اور معیشت پر سنگین اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ دستیاب اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یورپ اس معاملے میں دنیا کے دیگر خطوں سے کہیں آگے ہے۔

یورپ اور امریکہ میں فی کس شراب نوشی

عالمی ادارہ صحت (WHO) کی ایک رپورٹ کے مطابق، یورپی خطے کے لوگ شراب نوشی میں دنیا بھر سے آگے ہیں، جہاں ہر فرد سالانہ اوسطاً 9.2 لٹر شراب پی جاتا ہے۔ یہ شرح خطے میں شراب نوشی کے پھیلاؤ کی شدت کی نشاندہی کرتی ہے۔ نوجوانوں میں یہ رجحان خاص طور پر تشویشناک ہے۔ 15 سے 19 سال کی عمر کے تمام شراب نوشوں میں سے 45.9 فیصد کا تعلق یورپی خطے سے ہے، جبکہ براعظم ہائے امریکہ اس فہرست میں 43.9 فیصد کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شراب نوشی کا رجحان محض ایک ثقافتی روایت نہیں، بلکہ صحت عامہ کا ایک بڑا چیلنج ہے جو نوجوان نسل میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ روس، ترکیہ اور یوکرین جیسے ممالک میں ٹیکسوں میں اضافہ اور دستیابی میں کمی کی وجہ سے اس رجحان میں کمی آئی ہے، لیکن یورپی یونین کے رکن ممالک میں گزشتہ ایک دہائی سے اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں دیکھی گئی۔ یہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ پالیسیوں کی موجودگی کے باوجود، سماجی رویوں کو تبدیل کرنا ایک مشکل کام ہے۔

شراب نوشی کا ذہنی اور جسمانی صحت پر اثر

شراب نوشی کا ذہنی صحت کے مسائل سے گہرا تعلق ہے۔ انگلینڈ کی ایک تحقیقاتی کمیٹی نے یہ حیران کن انکشاف کیا ہے کہ 95 فیصد ذہنی امراض میں مبتلا لوگ شراب کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی طرح، فرانس کے اسپتالوں میں داخل ہونے والے 70 فیصد ذہنی مریضوں اور 60 فیصد مردوں کی بیماری کا تعلق شراب نوشی سے تھا۔ یہ تعلق دوطرفہ ہے ایک طرف، ڈپریشن اور اضطراب جیسے نفسیاتی مسائل افراد کو شراب کی طرف مائل کرتے ہیں، اور دوسری طرف، زیادہ شراب پینے سے یہ مسائل مزید بڑھ جاتے ہیں، جس سے ایک شیطانی چکر بن جاتا

ہے۔ شراب پینا دماغ میں سیر وٹونن جیسے خوشی کے ہارمونز کی سطح کو کم کرتا ہے، جو ڈپریشن کا براہ راست سبب بنتا ہے ۔

اس مسئلے کے معاشی اثرات بھی بہت سنگین ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق، فرانسیسی حکومت کو سالانہ 325 یورو کا نقصان اسپتالوں، عدالتوں اور نرسنگ ہومز پر آنے والے اخراجات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ نقصان شراب کی فروخت سے ہونے والی آمدنی (53 ملین یورو) سے کہیں زیادہ ہے ۔ یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ شراب نوشی صرف ایک انفرادی مسئلہ نہیں، بلکہ حکومتوں اور معاشرے پر ایک بڑا مالی بوجھ بھی ہے۔

جدول ا: امریکہ اور یورپ میں شراب نوشی کے اہم اعداد و شمار

ذریعہ	اعداد و شمار	زمرہ
	9.2لٹر سالانہ	یورپ میں فی کس کھپت
	(43.9 %: یورپ:45% امریکہ)	نوجوانوں**(15-19)** میں شرح
	مردوں کے مقابلے میں خواتین چار گنا کم پیتی ہیں	یورپ میں صنفی فرق
	95فیصد شراب کے عادی ہیں	ذہنی امراض کے مریضوں میں شرح(انگلینڈ)
	325یورو کا نقصان	حکومت فرانس پر سالانہ نقصان

باب دوم: خاندانی نظام میں ارتقاء اور سماجی استحکام کا چیلنج

خاندانی نظام کا روایتی ڈھانچہ امریکہ اور یورپ میں تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، جس کے سماجی استحکام پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

شادی اور طلاق کی شرح کا تقابلی جائزہ

امریکہ میں شادی کی شرح میں کمی اور طلاق میں اضافہ ہو رہا ہے، جہاں طلاق کی شرح 45 فیصد تک ہے۔ اس کے مقابلے میں، یورپی ممالک میں یہ شرح نمایاں طور پر زیادہ ہے

پرتگال میں 92 فیصد اور اسپین میں 85 فیصد شادیوں کا اختتام طلاق پر ہوتا ہے ۔ امریکی معاشرے میں 18 سے 44 سال کی عمر کے 59 فیصد افراد شادی کے بجائے بغیر شادی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان معاشروں میں رسمی ازدواجی بندھن کی اہمیت کم ہو رہی ہے اور ذاتی آزادی کو زیادہ ترجیح دی جا رہی ہے۔ ایک دلچسپ تضاد یہ ہے کہ امریکی، طلاق کی شرح زیادہ ہونے کے باوجود، دوبارہ شادی کے بارے میں کافی پر امید رویہ رکھتے ہیں۔ یہ رجحان اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ امریکہ میں شادی مالیاتی تحفظات اور سماجی مراعات سے منسلک ہے، جبکہ یورپ کے بہت سے ممالک میں یہ مراعات ازدواجی حیثیت سے قطع نظر ہر شہری کو حاصل ہوتی ہیں، جس سے وہاں شادی کی قانونی اہمیت قدرے کم ہو جاتی ہے ۔

بغیر شادی کے ساتھ رہنے **(Cohabitation)** کا بڑھتا ہوا رجحان اور اس کے نتائج

امریکہ اور یورپ میں بغیر شادی کے ساتھ رہنے والے جوڑوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ تاہم، تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس طرح کے تعلقات ازدواجی رشتوں کے مقابلے میں زیادہ غیر مستحکم ہوتے ہیں۔ بغیر شادی کے رہنے والے جوڑوں کے درمیان تعلقات کے ٹوٹنے کا امکان شادی شدہ جوڑوں کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ وہ بچے جو بغیر شادی کے رہنے والے جوڑوں کے ہاں پیدا ہوتے ہیں، ان کے والدین کے علیحدہ ہونے کا امکان شادی شدہ جوڑوں کے بچوں کے مقابلے میں تقریباً 90 فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اس مفروضے کی نفی کرتا ہے کہ Cohabitation شادی کا ایک فعال اور مستحکم متبادل ہے۔ خاندانی نظام کا یہ عدم استحکام بچوں کی نفسیاتی نشوونما پر گہرے منفی اثرات مرتب کرتا ہے، اور انہیں دیگر سماجی مسائل، جیسے شراب نوشی، کے خطرے میں ڈالتا ہے ۔

جدول ۲: امریکہ اور منتخب یورپی ممالک میں طلاق اور **Cohabitation** کی شرح

ملک	طلاق کی شرح	کی شرح **Cohabitation** (ترجیح)	**%**واحد والدین گھرانے
امریکہ	**45%**	**59%**(سال18-44)	
پرتگال	**92%**	**N/A**	
اسپین	**85%**	**N/A**	
یورپی اوسط	**50%**	**N/A**	
برطانیہ	**N/A**	**N/A**	

باب سوم: جنسی رویوں اور آزاد جنسی عمل کے اعداد و شمار

امریکہ اور یورپ میں جنسی رویے سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا عکس پیش کرتے ہیں، جن کا گہرا تعلق صحت عامہ کے دیگر مسائل سے ہے۔

نوجوانوں میں خطرناک جنسی رویے اور شراب کا کردار

شراب نوشی اور خطرناک جنسی رویوں کے درمیان ایک مضبوط اور ثابت شدہ تعلق ہے۔ 50 مطالعات کے ایک میٹا تجزیے سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ شراب نوشی کا نوعمروں اور نوجوان بالغوں میں کم عمری میں جنسی تعلقات کے آغاز، غیر محفوظ جنسی عمل، اور متعدد جنسی پارٹنرز رکھنے سے براہ راست تعلق ہے۔ ان رویوں کا خطرہ شراب نوشی کی وجہ سے نمایاں طور پر بڑھ جاتا ہے کم عمری میں جنسی تعلقات کا آغاز OR = 1.958 ، غیر محفوظ جنسی تعلقات OR = 1.228 اور متعدد پارٹنرز OR = 1.722 کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ اعداد و شمار ایک واضح وجہ نتیجہ کا تعلق قائم کرتے ہیں۔ شراب پینے سے جذباتی ممانعت کم ہو جاتی ہے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں غیر

محفوظ رویے سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک سنگین عوامی صحت کا مسئلہ ہے جو غیر ارادی حمل اور جنسی طور پر منتقل ہونے والی بیماریوں (STDs) میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

جدول ۳: شراب نوشی اور خطرناک جنسی رویوں کے درمیان تعلق

ذریعہ	**95%(CI)** کانفیڈنس انٹرول	**(OR)**اوڈز ریشو	خطرناک جنسی رویہ
	1.635-2.346	1.958	کم عمری میں جنسی تعلقات کا آغاز
	1.114-1.354	1.228	غیر محفوظ جنسی عمل
	1.525-1.945	1.722	متعدد جنسی پارٹنرز

جنسی تعلقات کے پارٹنرز کی اوسط تعداد

عالمی سطح پر، ایک شخص کی زندگی میں جنسی پارٹنرز کی اوسط تعداد 9 ہے۔ امریکہ میں یہ تعداد 10 سے 11 کے درمیان ہے۔ یورپ کے ممالک میں یہ تعداد مختلف ہے فن لینڈ اور ناروے میں یہ تعداد 12 سے زیادہ ہے، جبکہ جرمنی، پولینڈ اور بیلجیئم جیسے ممالک میں یہ اوسطاً 6 سے 7 ہے۔ یہ اعداد و شمار گہری ثقافتی تفریق کی عکاسی کرتے ہیں، جہاں جنسی رویے سماجی اقدار اور روایات سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ فرق عوامی صحت کی پالیسیوں کو علاقائی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ وسطی اور مشرقی یورپ میں ہم جنس پرستی اور غیر ازدواجی تعلقات کو اکثر اخلاقی طور پر غلط سمجھا جاتا ہے، جبکہ مغربی ممالک میں یہ رویے زیادہ قبول کیے جاتے ہیں۔ یہ تضاد ان معاشروں میں جنسی رویوں اور اس سے متعلق مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک اہم بصیرت فراہم کرتا ہے۔

باب چہارم: ذہنی صحت کی صورتحال اور نفسیاتی امراض کے اعداد و شمار

ذہنی صحت کے مسائل، جیسے ڈپریشن اور اضطراب، امریکہ اور یورپ میں ایک بڑھتا ہوا بحران ہیں۔

ڈپریشن اور اضطراب کی بڑھتی ہوئی شرحیں

امریکہ میں ڈپریشن کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، جہاں 2021 سے 2023 کے درمیان 12 سال اور اس سے زائد عمر کے ہر 8 میں سے 1 امریکی نے ڈپریشن کی علامات کا سامنا کیا۔ یہ تعداد گزشتہ ایک دہائی میں تقریباً دوگنا ہو چکی ہے۔ عالمی سطح پر 5.7 فیصد بالغ افراد ڈپریشن کا شکار ہیں، اور یہ خواتین میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ عام ہے۔ ماہرین معاشیات کے مطابق، معاشی بحران اور بے روزگاری امریکہ اور یورپ میں ڈپریشن میں اضافے کی بڑی وجوہات میں شامل ہیں، جو کچھ لوگوں کو خودکشی کی طرف بھی مائل کر رہی ہیں ۔یورو/اینگلو ثقافتوں میں اضطراب کی شرح (10.4%) عالمی اوسط سے زیادہ ہے۔ یہ زیادہ شرح ان معاشروں کی انفرادیت پسند اور مسابقتی نوعیت کی وجہ سے ہو سکتی ہے، جہاں افراد پر کامیابی اور معاشی استحکام کا شدید دباؤ ہوتا ہے ۔

خودکشی کے رجحانات اور عوامل

خودکشی نوجوانوں (15-29 سال) میں موت کی ایک بڑی وجہ ہے۔ عالمی سطح پر، مردوں میں خودکشی کی شرح خواتین کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ ہے۔ امریکہ کے مغربی علاقوں میں خودکشی کی شرح زیادہ ہے، جس کی ایک اہم وجہ مہلک ہتھیاروں تک آسان رسائی ہے۔ یہ اعداد و شمار اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگرچہ خودکشی کا ارادہ ذہنی صحت کے مسائل کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ پالیسیوں اور ہتھیاروں کی دستیابی جیسے عوامل سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ ذہنی صحت کے مسائل کے بڑھنے کے باوجود، عالمی سطح پر صحت کے بجٹ کا صرف 2 فیصد اس پر خرچ کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بڑھتے ہوئے بحران سے نمٹنے کے لیے موجودہ وسائل ناکافی ہیں ۔

جدول ۴: امریکہ اور یورپ میں ڈپریشن اور خودکشی کی شرح

ذریعہ	اعداد و شمار	زمرہ

	12 + عمر کے ہر 8 میں سے 1 کو علامات کا سامنا	امریکہ میں ڈپریشن کی شرح
	بالغ افراد 5.7 %	عالمی ڈپریشن کی شرح
	29 -15 سال کی عمر میں موت کی بڑی وجہ	نوجوانوں میں خودکشی
	عالمی اوسط سے دوگنا سے زیادہ	مردوں میں خودکشی کی شرح

باب پنجم: باہمی ربط اور کلیدی بصیرتیں

اس رپورٹ میں جمع کیے گئے اعداد و شمار اور ان کا تجزیہ ایک مربوط تصویر پیش کرتا ہے جہاں چاروں موضوعات ایک دوسرے سے گہرائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تعلقات ایک شیطانی چکر کی شکل اختیار کرتے ہیں جو ان معاشروں میں بڑھتے ہوئے عدم استحکام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

خاندانی عدم استحکام کا شیطانی چکر : خاندانی نظام کا ٹوٹنا (طلاق یا بغیر شادی کے ساتھ رہنے والے تعلقات کا خاتمہ) نوجوانوں کے لیے ایک غیر مستحکم ماحول پیدا کرتا ہے۔ اس غیر مستحکم ماحول میں، نوجوانوں میں شراب نوشی کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ شراب نوشی نہ صرف خود ایک مسئلہ ہے بلکہ یہ غیر محفوظ جنسی رویوں اور نفسیاتی مسائل میں بھی اضافے کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جہاں ایک مسئلہ دوسرے کو جنم دیتا ہے، اور ہر اگلا قدم پچھلے مسئلے کی شدت کو مزید بڑھا دیتا ہے۔

معاشی اور سماجی عوامل کا کردار : یہ نفسیاتی اور سماجی مسائل محض ذاتی نہیں ہیں۔ معاشی بدحالی اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری براہ راست ڈپریشن اور دیگر نفسیاتی امراض کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح، خاندانی نظام میں تبدیلی، جیسے واحد والدین کے گھرانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، غربت اور سماجی عدم مساوات کو فروغ دیتی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ نیٹ ورک ہے جہاں معاشی دباؤ، سماجی ڈھانچے کی تبدیلی اور انفرادی رویے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

پالیسیوں کے لیے مضمرات : ان گہرے تعلقات کا سب سے اہم مضمر یہ ہے کہ ان مسائل کو الگ الگ حل نہیں کیا جا سکتا۔ صرف شراب نوشی کی روک تھام کے پروگرام، یا صرف ذہنی صحت کی خدمات میں اضافہ، اس بحران سے نمٹنے کے لیے ناکافی ہوگا۔ ایک مؤثر حکمت عملی کے لیے ان تمام عوامل کو ایک جامع نقطہ نظر سے دیکھنا ضروری ہے اور ایسے اقدامات کرنا ضروری ہیں جو اس شیطانی چکر کو توڑ سکیں۔

خلاصہ اور نتیجہ

اس رپورٹ کے مرکزی نتائج سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امریکہ اور یورپ میں خاندانی نظام کا روایتی ڈھانچہ کمزور ہو رہا ہے، ذہنی صحت کے مسائل میں نمایاں اضافہ ہو رہا ہے، شراب نوشی ایک وسیع سماجی مسئلہ بن چکی ہے، اور آزاد جنسی رویوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تمام رجحانات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خاندانی استحکام کا فقدان نوجوانوں میں خطرناک رویوں اور نفسیاتی مسائل کو فروغ دیتا ہے، جو معاشرتی اور معاشی دباؤ سے مزید بڑھ جاتے ہیں۔ یہ تمام عوامل مل کر ان معاشروں میں ایک گہرے سماجی اور نفسیاتی بحران کی نشاندہی کرتے ہیں۔

سفارشات

اس تجزیاتی رپورٹ کی بنیاد پر، درج ذیل سفارشات عوامی پالیسی سازوں، ماہرین صحت اور سماجی کارکنوں کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

1. جامع صحت عامہ کی پالیسیاں **:** ایسے پروگرام مرتب کیے جائیں جو شراب نوشی، نفسیاتی امراض اور خاندانی عدم استحکام سے نمٹنے کے لیے ایک مربوط طریقہ کار اختیار کریں۔
2. خاندانی معاونت کے پروگرام **:** ان خاندانوں کے لیے قانونی، مالی اور نفسیاتی معاونت فراہم کی جائے جو طلاق، Cohabitation کے خاتمے، یا واحد والدین کی حیثیت کی وجہ سے عدم استحکام کا شکار ہیں۔

3. ذہنی صحت کی خدمات میں اضافہ **:** قومی صحت کے بجٹ میں ذہنی صحت کے لیے مختص رقم میں نمایاں اضافہ کیا جائے اور ان مسائل سے متعلق سماجی بدنامی کو ختم کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر شعور اجاگر کیا جائے۔
4. نوجوانوں کے لیے تعلیمی پروگرام **:** اسکولوں اور کمیونٹی مراکز میں جامع اور مؤثر تعلیمی پروگرام شروع کیے جائیں جو جنسی صحت، مادہ کے غلط استعمال، اور صحت مند تعلقات کے بارے میں معلومات فراہم کریں، تاکہ نوجوانوں کو صحت مند فیصلے کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کے نقصانات

یونیورسٹی آف ٹورنٹو ، کینیڈا کے الیکٹریکل انجینئرنگ کے پروفیسر جارج سینکلیئر (George Sinclair) اپنے ۱۹۸۰ء کے مقالے میں لکھتے ہیں کہ شاید ''ٹیکنالوجی'' کی اتنی ہی تعریفیں ہوں کہ جتنے اس کے استعمال کرنے والے ہیں، یعنی ٹیکنالوجی کی تعریف کا انحصار ٹیکنالوجی کے استعمال کرنے والے پر ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''ٹیکنالوجی'' کی تعریف کرنے کے لیے پروفیسر کارل مٹچیم (Carl Mitcham) کو پینسٹھ صفحات درکار ہوئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مؤرخین اور فلسفی جس طریقے سے ٹیکنالوجی کی تعریف پیش کرتے ہیں، وہ اس ٹیکنالوجی کو ایجاد کرنے والے انجینئروں، سائنسدانوں اور محققین کے یہاں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی فلسفیانہ، تاریخی اور عملی تعریف کی بحث میں پڑے بغیر ہم اپنے قارئین کے لیے ٹیکنالوجی کی آسان تعریف پیش کرتے ہیں۔ برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ''سائنسی علم کے انسانی زندگی کے عملی مقاصد کے لیے استعمال کو ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔'' کیمبرج ڈکشنری کے مطابق ''سائنسی علم کے کاروبار، صنعت یا مینوفیکچرنگ میں استعمال کو ٹیکنالوجی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' یا مزید آسان الفاظ میں: ''سائنسی دریافتوں کے عملی، خاص طور پر صنعتی استعمال کو ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔''

ٹیکنالوجی کے استعمال سے جہاں انسانیت نے بے تحاسا فوائد اُٹھائے ہیں، مثلاً آمد و رفت میں آسانی سے لے کر علاج معالجہ وغیرہ، وہیں ٹیکنالوجی کے استعمال میں جب افراط و تفریط کا رویہ بڑھتا گیا تو اسی ٹیکنالوجی نے نسلیں تباہ کر دیں۔ ایک اہم بات کہ عمومی طور پر سائنسدان اور محققین اپنی سائنسی تحقیقات، ایجادات اور ٹیکنالوجیز انسانیت کے فائدے کے لیے پیش

کر رہے ہوتے ہیں، مگر ان کی ایجادات اور سائنسی تحقیقات و ٹیکنالوجی کو بڑے بڑے سرمایہ دار اچک لیتے ہیں اور اس ٹیکنالوجی سے پیسے بنانے لگ جاتے ہیں۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی کہ اس وقت عالمی سطح پر کون سی سائنسی تحقیقات ہونی چاہئیں یا کون سی ٹیکنالوجی کے متعلق قوانین بنانے چاہییں اور اس کو فروغ دینا چاہیے یا حکومتوں یا فنڈنگ ایجنسیز کو کس سائنسی شعبے میں زیادہ سرمایہ لگانا ہے، اس میں بھی دراصل عالمی معاشی سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے والوں کا کافی کردار ہوتا ہے۔ گو کہ سائنس دانوں اور محققین کی ایک بڑی تعداد اپنی تحقیقات میں اخلاص سے لگی رہتی ہے، مگر انہی تحقیقات کو زیادہ تر فروغ ملتا ہے جو کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دیتی ہیں، جن سے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے والوں کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں، جو ان کے نظریات کی تائید میں ہوتی ہیں اور ان کے ایجنڈے کو فروغ دیتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے والے ہی دراصل پوری دنیا کی ٹیکنالوجی کو آگے فروغ دیتے ہیں اور پورے عالمی معاشی نظام کو اپنے قبضے میں لے کر ''قدر'' اور ''اقدار'' کی نئی تعریف بھی خود ہی کرتے ہیں، یعنی یہ جب چاہتے ہیں فرضی، تخیلاتی چیزوں کو قابل قدر بنا کر خرید و فروخت شروع کروا دیتے ہیں اور یہ جب چاہتے ہیں ''اقدار'' کی تعریف بھی متعین کر دیتے ہیں کہ معاشرے میں موجود سب سے بری چیز بھی لوگوں کو معزز لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرکاری قانون، اخلاقیات اور مذہبی پابندیوں کو مد نظر نہیں رکھا جاتا اور اصل مقصد پیسہ کمانا ہی ہوتا ہے، لہٰذا اس کا عملی نتیجہ جو سامنے آتا ہے، اس سے معاشرے میں صرف اور صرف معاشی اُبتری اور اخلاقی گراوٹ ہی ہوتی ہے۔

قارئین! اب ہم انہیں ٹیکنالوجیز میں سے ایک ٹیکنالوجی کی شکل یعنی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی میں سوشل میڈیا، کمپیوٹر، اسمارٹ فون، اسمارٹ ٹی وی، آن لائن گیمز وغیرہ آتے ہیں۔ آن لائن اعداد و شمار جمع کرنے والی ویب سائٹ اسٹیٹا سٹا

Statista.com کے مطابق پوری دنیا میں صرف سوشل میڈیا کے استعمال کرنے والوں کی تعداد سوا پانچ ارب سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان میں فیس بک (میٹا)، یوٹیوب، انسٹا گرام، واٹس ایپ، ٹک ٹوک، وی چیٹ، ٹیلی گرام، اسنیپ چیٹ، ٹوئٹر (ایکس) وغیرہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والے پلیٹ فارمز اور ایپلیکیشنز ہیں۔ سوشل میڈیا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عمومی طور پر کمپیوٹر اور موبائل فون کو استعمال کیا جاتا ہے۔

جہاں تک موبائل فون کا تعلق ہے تو موبائل فون کی ایجاد نے جہاں آپس کے رابطے میں سہولت پیدا کی تھی، وہیں ایمرجنسی کی صورت میں فوری رابطہ کرنے کے ذرائع بھی عوام کو میسر آئے، مگر جوں جوں کمپیوٹر سائنس اور ٹیکی کمیونیکیشن انجینئرنگ میں ترقی ہوئی، اس موبائل فون نے بھی ترقی کے مراحل طے کیے اور اب ہمارے سامنے موبائل فون کی جدید شکل اسمارٹ فون کی صورت میں موجود ہے، لہٰذا عمومی طور پر جب ہم موبائل فون کہتے ہیں تو اس سے یہی اسمارٹ فون مراد ہوتا ہے، لہٰذا ہم اپنے اس مضمون میں موبائل فون اور اسمارٹ فون کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کریں گے۔ اس اسمارٹ فون کو اب بلا مبالغہ دسیوں قسم کے کاموں میں استعمال کیا جا رہا ہے، جن میں ای میل، فیکس، اسکیننگ سے لے کر گیمنگ، ٹریڈنگ، کیلکولیٹر، کیمرہ اور ویڈیوز دیکھنے تک شامل ہیں۔ اب سے بیس پچیس سال پہلے گھروں میں جو ٹی وی ہوا کرتا تھا، اس میں وہی ٹی وی چینلز اور پروگرام دیکھے جا سکتے تھے کہ جو حکومتی اجازت سے ٹی وی چینلز نشر کرتے تھے۔ اگر کسی کو اپنی پسند کی فلم یا کوئی پروگرام دیکھنا ہوتا تو اس کے لیے وہ علیحدہ سے وی سی آر لے کر آتا اور پھر اس کے ذریعے سے اپنے من پسند پروگرامز کو دیکھتا۔ اسمارٹ فون نے انسانوں کو ان مختلف الیکٹرانک آلات کی قید سے بھی نجات دے دی اور اب اسی اسمارٹ فون پر وہ جب چاہے، جہاں چاہے اور جس طرح کے پروگرامز چاہے دیکھ سکتا ہے۔ نیز بڑی ٹیکنالوجی کمپنیوں نے جس طرح سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو فروغ دیا ہے، اس کے نتیجے میں بچے اور نوجوان بے حیائی، عریانی، فحاشی، گیمنگ،

چیٹنگ، جوا، سٹہ اور سود جیسی مخرب اخلاق اسکیموں کے عادی ہو چکے ہیں اور اخلاقی گراوٹ کی پستیوں میں گر چکے ہیں، الا ماشاء اللہ۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ موبائل فون اور سوشل میڈیا کے استعمال سے دماغی صحت پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے اور سائنسدانوں کی تحقیق کے مطابق بالخصوص بچوں اور نوجوانوں کے لیے تو اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا بہت نقصاندہ ہے۔ اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا کے تباہ کن اثرات اب کسی سے مخفی نہیں۔ انہی تباہ کن اثرات کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے قوانین بننا شروع ہو چکے ہیں، جن میں واضح طور پر موبائل فون اور سوشل میڈیا کے استعمال پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ میں ایک چھوٹے سے یورپی ملک آئرلینڈ کی مثال پیش کرنا چاہوں گا کہ جہاں پر پرائمری اسکولوں میں بچوں کے سوشل میڈیا کے استعمال اور موبائل فون لانے پر پابندی ہے اور اگر کوئی طالب علم موبائل فون اسکول لے کر آئے گا تو اسکول ٹیچر اس کا موبائل فون ضبط کر لیتے ہیں۔

آئرلینڈ کی وزارت تعلیم کی وزیر نورما فولے Norma Foley سیکنڈری اسکولوں میں بھی اسمارٹ فون لانے پر پابندی لگانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں، ان کا بیان ہے کہ:

''وزارت تعلیم کی وزیر موبائل فون کو تمام سیکنڈری اسکولوں میں لانے پر پابندی لگانے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں، اس تحقیق کے نتیجے میں جو کہ طالب علموں کے آلات (موبائل فون) کے استعمال کرنے کو ان میں انتشار پیدا ہونے (یعنی ان کی توجہ تعلیمی کاموں سے ہٹنے) اور سائبر ہراسانی کا شکار ہونے سے جوڑتی ہے، جب کہ زیادہ تر سیکنڈری اسکول موبائل فون پر پابندی لگاتے ہیں یا طلباء کو موبائل فون لاکرز میں رکھنے پر مجبور کرتے ہیں نورما فولے اس بات پر قائل ہیں کہ موبائل فون پر وسیع ترین پابندی ہی آگے بڑھنے کا بہترین طریقہ ہے۔''

قارئین! دیکھیے کہ جس تحقیق کا آئرلینڈ کی وزارت تعلیم کی وزیر حوالہ دے رہی ہیں،

اس میں دو بنیادی وجوہات ذکر کی گئی ہیں: اول طلباء کا پڑھائی سے رجحان ہٹنا اور دوسرا سائبر ہراسانی۔ اقوام متحدہ کا فنڈ برائے اطفال یونیسیف کے مطابق سائبر بلینگ Cyberbullying یعنی سائبر ہراسانی کی تعریف یہ ہے کہ کوئی شخص ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز مثلاً انٹرنیٹ، سوشل میڈیا یا موبائل فون کا استعمال کرتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو ڈرائے، اُس کے متعلق جھوٹ بولے، اُسے دھمکائے، گالی گلوچ کرے، ہراساں کرے، اسے جان بوجھ کر تکلیف پہنچائے، جعلی اکاؤنٹ بنا کر غیر مناسب میسجز دوسرے کو بھیجے اور دوسرے شخص کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ دونوں ہی وجوہات ایسی ہیں جن سے بچوں اور طلباء کا مستقبل داؤ پر لگتا ہے اور وہ طرح طرح کے نفسیاتی ذہنی اور دیگر امراض کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک اور تحقیقی رپورٹ یہ بیان کرتی ہے کہ ان ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز، سوشل میڈیا اور اسمارٹ فون کے استعمال سے ڈی ہیومنائزیشن Dehumanisation یعنی انسان میں سے انسانی صفات کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(مغربی ترقی یافتہ ممالک میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز پر عائد پابندیاں)

آئرلینڈ تو ایک چھوٹا سا یورپی ملک ہے، آپ اقوام متحدہ کی تعلیمی، علمی و ثقافتی تنظیم یونیسکو کی گلوبل ایجوکیشن مائیٹرنگ رپورٹ ۲۰۲۳ء کو ہی دیکھ لیجیے جو کہ واضح طور پر کہتی ہے کہ: ''موبائل فون اسکولوں میں سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ بنتے ہیں۔'' رپورٹ میں درج ہے کہ بلیجیم، اسپین اور برطانیہ میں اسکولوں میں سے اسمارٹ فون کو ختم کرنے سے بچوں کے سیکھنے کے عمل میں بہتری آئی ہے۔ یہ رپورٹ چار سو پینتیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس کو عالمی ماہرین تعلیم نے مرتب کیا ہے۔ یوں تو یہ رپورٹ پوری ہی پڑھنے کے قابل ہے، کیوں کہ یہ ٹیکنالوجی کا تعلیمی اداروں اور تعلیم پر اس کے اثرات کا ذکر کرتی ہے، مگر اس رپورٹ کا آٹھواں باب نہایت اہمیت کا حامل ہے، جس میں ٹیکنالوجی کے منفی اثرات اور عالمی سطح پر ٹیکنالوجی، موبائل فون اور سوشل میڈیا پر عالمی پابندی کے قوانین کو تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔

ستمبر ۲۰۲۴ء کو برطانوی اخبار گارڈین میں چھپنے والی ''ہم پچھلے زمانے میں واپس جا رہے ہیں'' رپورٹ کے مطابق کئی یورپی ممالک اسمارٹ فون کے اسکولوں میں لانے پر تدریجاً پابندی لگا رہے ہیں، جن میں سرفہرست نیدرلینڈ، فرانس، ہنگری، اٹلی اور یونان جیسے ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک کے اسکولوں سے جڑے ماہرین تعلیم کا یہ ماننا ہے کہ جب ہم اسکولوں میں تمام بچوں کو دیکھتے ہیں تو وہ برآمدہ میں ٹہلتے ہوئے اسمارٹ فون میں منہمک نظر آتے ہیں، اُن کی آپس کی بات چیت ختم ہو چکی ہے اور کھیل کھیلنے والی ٹیبل ٹینس کی ٹیبلیں ویران پڑی رہتی ہیں اور بنیادی طور پر سماجی ثقافت کو کھو بیٹھے ہیں۔

اسی طریقے سے نیدرلینڈ کی حکومت نے موبائل فون، اسمارٹ واچز (گھڑیوں) اور ٹیبلٹس پر اسکولوں میں پابندی عائد کر دی ہے۔ اس وقت برطانوی پارلیمنٹ میں اس موضوع پر قانون سازی کے لیے بحث چل رہی ہے کہ کیا اسکولوں پر یہ لازم کر دیا جائے کہ وہ مکمل طور پر موبائل فون فری ہوں؟ آرگنائزیشن آف اکنامک کارپوریشن اینڈ ڈیولپمنٹ (اوای سی ڈی) یعنی اقتصادی تعاون و ترقی کی عالمی تنظیم کی رپورٹ کے مطابق حد سے زیادہ ڈیجیٹل آلات کے کلاس روم میں استعمال سے طلباء کی تعلیمی کارکردگی پر منفی اثر پڑتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں کم از کم انیس ریاستوں نے ایسے قوانین منظور کیے ہیں یا ایسی پالیسی نافذ کی ہیں جو ریاست بھر میں طلباء پر اسکولوں میں اسمارٹ فون کے استعمال پر پابندی عائد کرتی ہیں۔

آسٹریلیا کی حکومت نے پچھلے مہینے یعنی نومبر ۲۰۲۴ء کو سولہ سال تک کی عمر کے بچوں کو سوشل میڈیا استعمال کرنے پر پابندی کا قانون نافذ کر دیا ہے اور اس کی پارلیمنٹ نے دنیا کا سخت ترین قانون پاس کیا ہے۔ آسٹریلین وزیر برائے مواصلات میشیل رولینڈ (Michelle Rowland) کے مطابق ٹک ٹاک، فیس بک، انسٹاگرام ایکس (ٹیوٹر)، اسنیپ چیٹ وغیرہ پر ۲۰۲۵ء تک مکمل پابندی لگائی جائے گی۔ آسان الفاظ میں سولہ سال کی عمر کے بعد ہی کوئی آسٹریلیا میں سوشل میڈیا کو استعمال کر سکے گا اور یہ پابندی صرف

سوشل میڈیا کے اسکولوں میں استعمال تک محدود نہیں ہے، بلکہ چوبیس گھنٹے سولہ سال کے کم عمر بچوں کو مکمل طور پر سوشل میڈیا استعمال کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیوں ہمارے حکومتی عہدے داروں، سیاستدانوں، پالیسی بنانے والوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں، کالجز اور یونیورسٹیوں سے جڑے لوگوں کو یہ ترقی یافتہ ممالک کے قوانین اور پالیسیاں نظر نہیں آتیں؟

(چند گزارشات)

آخر میں ہم اس مضمون کے ذریعے ٹیکنالوجی کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا چاہیں گے:

اسکولوں کے اندر بچوں کے موبائل فون اور اس سے جڑی ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے لانے اور استعمال پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ یہ صرف راقم کی تجویز نہیں ہے، بلکہ یہ تجویز اقوام متحدہ کی تعلیمی، علمی و ثقافتی تنظیم یونیسکو کی جانب سے گلوبل ایجوکیشن مانیٹرنگ رپورٹ ۲۰۲۳ء میں دی گئی ہے اور اس پر کئی ترقی یافتہ ممالک نے عمل بھی کیا ہے اور ان ممالک میں اسکولوں میں بچوں کے موبائل فون لانے پر پابندی ہے۔

ان ممالک میں برطانیہ، آئرلینڈ، اسپین، بیلجیم اور دیگر کئی ممالک شامل ہیں۔

بچوں اور نوجوانوں کے سوشل میڈیا کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کی جائے اور اس کے لیے مناسب قانون سازی کی جائے۔ آسٹریلیا کی ہی مثال دیکھ لی جائے کہ وہاں پر سولہ سال سے کم عمر بچوں پر سوشل میڈیا کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

پرائمری و سیکنڈری اسکولوں میں بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے انہیں جدید ٹیکنالوجیز سے دور رکھا جائے، اس کے لیے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں جو قانون سازی اور پالیسیاں نافذ کی گئی ہیں، اُن کو دیکھ لیا جائے۔

محمد موسیٰ بھٹو

مغربی تہذیب سے وابستہ لوگوں کی بعض خوبیاں

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی تہذیب ساری خرابیوں سے عبارت نہیں ہوتی، اس میں مثبت اور صحتمند پہلو بھی موجود ہوتے ہیں، اگر کسی تہذیب میں مثبت پہلو موجود نہ ہوں تو وہ مٹ جاتی ہے اور اسے زندہ رہنے کا حق نہیں ہوتا، یہی معاملہ مغربی تہذیب کے ساتھ ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے اور مختلف پہلوؤں سے بظاہر ترقی کر رہی ہے۔

مغربی تہذیب کی وہ خوبیاں جو اسے باقی رکھے ہوئی ہے، وہ کچھ اس طرح ہیں، نظام تعلیم کے ذریعہ اپنی قوم سے وابستہ افراد کی تربیت اس طرح کرتی ہیں کہ وہ مادی طور پر عروج وزوال کے اصولوں سے واقف ہو جاتے ہیں پھر وہ زندگی بھر ان اصولوں کی پابندی کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔

وہ ملک و قوم کو نقصان پہنچانے سے حتی الامکان بچنے کی سعی کرتے ہیں، ملک سے آخری حد تک محبت کرتے ہیں، ہمارے ہاں لوگ ملک سے بد ظن ہو کر مغربی ملکوں میں آباد ہونے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں، جب کہ مغربی تہذیب سے وابستہ افراد اپنے ملک سے دوسرے ملکوں میں منتقل ہونے کے لئے سوچ بھی نہیں سکتے۔

وہاں ریاست سے وابستہ مختلف شعبوں کے افسران قومی خدمت کے کاموں کو خوشی سے سرانجام دیتے ہیں، لوگوں سے رشوت لینے کے لئے دفتری رکاوٹوں کا بہانہ بنا کر لوگوں کو برسوں تک پریشان نہیں کرتے، وہ نہایت مستعدی سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے لوگوں کی مشکلات حل کرتے ہیں۔

مغربی ملکوں میں عدلیہ آزاد ہوتی ہے، کوئی دباؤ قبول کرتی ہے اور نہ ہی پیسے لیتی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عدلیہ کے ہاں آنے والے بڑے سے بڑے فیصلہ سال دو کے اندر طے ہو جاتے ہیں، جب کہ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی عمریں پوری ہو جاتی ہیں، فیصلے نہیں ہو پاتے، وہ بیچارے انصاف کے انتظار میں بیس بیس سال تک عدالت کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

وہاں دفتری اوقات میں لوگ پابند ہوتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف دفتری کام سرانجام دیں، اسے وہ اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں، جب کہ ہمارے ہاں دفتری اوقات میں لوگ باتوں اور ملاقاتوں میں وقت صرف کر دیتے ہیں۔

وہاں لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں، وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے، مصنوعی طور پر مہنگائی بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے، پھر وہاں فلاحی سسٹم موجود ہے جس کے تحت لوگوں کی روزی کا انتظام ہوتا ہے اور ہر شہری کا مفت میں بیماری کا علاج ہوتا ہے، علاج پر چاہے لاکھوں روپے کے اخراجات ہوں، وہ حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں، بیمار کی بیماری کی نوعیت اگر کچھ سنگین ہے تو اس کے گھر پر ۲۴ گھنٹے سرکاری گاڑی کھڑی ہوتی، جو ہنگامی حالات میں اسے اسپتال پہنچاتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی بعض خوبیاں مغربی تہذیب سے وابستہ افراد میں ایسی ہیں، جو ان قوموں کو اب تک زندہ رکھے ہوئی ہیں اور ان کے لئے ترقی کا ذریعہ بھی ہیں، اگرچہ ان کے ہاں پاکیزہ اخلاقیات پر مبنی نظام نہیں ہے، لیکن قومی اخلاق اور کاروباری اخلاق موجود ہے، جس کے وہ فوائد سمیٹ رہے ہیں۔

مغربی اور اسلامی تہذیب

(مختصر جائزہ)

اس وقت دنیا میں دو تہذیبیں ہیں، جن سے لوگوں کی بڑی تعداد وابستہ ہے، اسلامی تہذیب آفاقی تعلیمات پر مشتمل ہے جو فطرت انسانی سے بھی ہم آہنگ ہے، جب کہ مغربی تہذیب عقل کے استعمال کے ذریعہ وجود میں آنے والے نظریات پر مشتمل ہے، جس میں خواہشات نفس کے مطابق زندگی گزارنے پر زور ہے، وہ چیز اچھی ہے جس سے خواہشات کی تکمیل ہو اور ہر وہ چیز بری ہے، جس سے خواہشات کی روک تھام کی صورت پیدا ہو، مغربی تہذیب نے ٹیکنالوجی کو ترقی دی، اور اسے حد سے زیادہ اہمیت دی، اس ٹیکنالوجی کے ذریعہ دو نقصان ہوئے، ایک تو جنسی میلاپ کے عمل کی ٹیکنالوجی کے ذریعہ بہت زیادہ تشہیر ہوئی، جس سے خود ان کی نسلیں، اسکول کے بچے اور لڑکیاں تک جنسی عمل میں مبتلا ہوئیں، جس سے ان کی صلاحیتیں تعلیم سے ہٹ کر جنسی عمل کی طرف ہونے لگی، ٹیکنالوجی سے دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اس سے مصنوعی ذہانت کا دروازہ کھل گیا، اس سے معلومات تو بہت حاصل ہوئیں، لیکن انسانی ذہانت کا بحران پیدا ہوا اس کی وجہ یہ بنی کہ جب لوگوں کو ہر موضوع پر تیار شدہ مواد ملنے لگا تو وہ غور و فکر اور تحقیق سے کام کیوں لیں۔ چنانچہ انسانی ذہانت کے زیادہ استعمال سے مغرب نے جو ترقی کی تھی، مصنوعی ذہانت نے ترقی کے اس عمل کو روکنے کا کردار ادا کیا، خواہشات نفس اور ٹیکنالوجی کے زیادہ استعمال نے مغرب کو زوال سے دوچار کر دیا ہے۔

اسلامی تہذیب میں اچھائی اور نیکی کا معیار خواہشات نفس کو ضابطہ میں لا کر اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں لانا اور انسان کو سلیقہ انسانیت سے بہرہ ور کرنا ہے، بُرائی وہ ہے جس سے خواہشات نفس کی تکمیل ہو اور انسانی وقار کے منافی سرگرمیاں ہوں۔

اس دور میں اسلامی تہذیب کو پوری طرح کام کرنے کا موقعہ اس لئے نہ مل سکا کہ مغرب کی تعلیمی، عسکری اور مالیاتی بالادستی نے مسلمان ممالک کے مؤثر طبقات کو مغرب کی ذہنی غلامی کی حالت میں مبتلا کر دیا۔ اور انہوں نے مسلمان ممالک میں اسلامی تہذیب کو نہ صرف فروغ ہونے نہیں دیا، بلکہ انہوں نے ریاستی وسائل کو مغربی تہذیب کی برتری کے مقصد کے لئے استعمال کیا، اس طرح انہوں نے اسلام اور اسلامیت سے بھی انحراف کی راہ اختیار کی تو دنیا کو اسلام جیسی روشن تہذیب سے آشنا کرنے سے محروم رکھا۔

مغرب کا پوری طرح زوال سے بچنے کا سبب یہ ہے کہ ان میں بعض خوبیاں کسی حد تک موجود ہیں، عدلیہ کی آزادی، روزگار کی ضمانت، وقت اور وعدہ کی پابندی، کاروباری، سیاسی اور قومی اخلاق، دنیا بھر کے باصلاحیت اور علوم وفنون کے ماہر افراد کو اپنے ملکوں میں آباد ہو کر ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا وغیرہ۔

محمد موسیٰ بھٹو

مغرب میں آباد مسلمانوں کے حالات

مغرب میں مسلمانوں کی منتقلی کا سلسلہ کافی عرصہ سے جاری ہے، لاکھوں سے زیادہ مسلمان ہیں، جو وہاں مستقل طور پر آباد ہیں، اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

مغربی تہذیب جو اسلام سے متصادم اور نفس پرستی پر مبنی تہذیب ہے، مغرب میں اس تہذیب کی طوفانی لہریں ہیں، جو لوگوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں، ایسی تہذیب کے مراکز میں جا کر آباد ہونا، یہ اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

مغرب میں منتقل ہو کر مستقل آباد ہونے کی روش اپنے ملکوں کے حالات سے بددلی کا نتیجہ ہو یا روزگار اور معاشی خوشحالی اس کا سبب ہو، اسلامی نقطہ نگاہ سے اس کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہوتی۔ قرآن میں ایک جگہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ (ایمان کے تحفظ کے لئے) ہجرت اختیار نہیں کرتے، مرتے وقت فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ہجرت کیوں نہیں کی پھر فرشتے ان کو مارتے ہیں۔

مغرب میں آباد ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا معاملہ جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود تو کسی نہ کسی حد تک مادیت کے سیلاب سے بچنے میں کامیاب ہوتے ہیں، لیکن ان کی اولاد مادی تہذیب کا حصہ بن کر بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے، وہاں مادر پدر آزادی کی روح اس تیزی سے پھونکی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی شادیاں ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اور ان کی اولاد ان سے باغی ہو جاتی ہے، نوے فیصد سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ یہ حالات پیش آتے ہیں، دس فیصد خوش نصیب افراد اپنے ایمان کے خصوصی اہتمام اور اللہ کے فضل خاص سے بچ جاتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کی تنظیم کے ایک سربراہ پچھلے دنوں کراچی آئے تھے، انہوں نے ایک تقریب میں وہاں کے مسلمانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں مسلمانوں کی اسلامیت کو سخت خطرہ درپیش ہے، پہلے تو رمضان شریف کی تراویح کے لئے مسلمان ممالک سے حفاظ بلائے جاتے تھے، اب وہاں حافظ کافی مقدار میں موجود ہیں، لیکن اب مقتدی نہیں ملتے، مقتدی بھی شاید باہر سے بلانے پڑیں، سبب یہ ہے کہ مادیت پرستی کے ماحول نے نئی نسلوں کی دینی ومذہبی حالت کو بگاڑ دیا ہے اور انہیں مادہ پرست بنادیا ہے، تنظیم کے ذمہ دار نے ایک واقعہ یہ بتایا کہ ہم امریکہ کے ایک شہر میں مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے گئے تو ہمیں ایک ہوٹل نظر آیا، جس پر مسلمانوں کا نام لکھا ہوا تھا، ہم ہوٹل میں اندر گئے، مالک سے ملے، انہوں نے بتایا کہ ہمارے دادا مسلمان تھے، مجھے اور میرے بھائیوں کو اسلام اور مسلمانیت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ کیا ہوتی ہے، البتہ مسلمانوں کے سے نام ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض اچھے خاصے دیندار لوگ جو یہاں معاشی طور پر مستحکم تھے، وہ بھی اپنی ساری جائداد بیچ کر اپنے بچوں سمیت وہاں منتقل ہوگئے، میں اس طرح کے کئی خاندانوں کو جانتا ہوں۔

یہ بہت تشویشناک صورتحال ہے، جو پیدا ہوگئی ہے، امریکہ اور یورپ کے لئے اتنی کشش کا ہونا، وہ بھی دیندار افراد میں سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ مغرب میں آنے والی نسلوں کا اسلام پر قائم نہ رہنے کا خطرہ ایسا ہے جسے دیکھکر وہاں آباد مسلمانوں کو آنکھیں بند کرکے اپنے ملکوں میں واپس آنا چاہئے، آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے یورپ کا دورہ کرتے ہوئے وہاں مسلمانوں سے فرمایا تھا کہ چونکہ یہاں ان کی نسلوں کا بنیادی ایمان ہی خطرے میں ہے، اس لئے انہیں اپنے ملکوں میں واپس آنا چاہے، اپنے ملکوں میں انہیں روڈ ماسٹری ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

ایک عالم ربانی کی طرف سے مسلمانوں کو بروقت انتباہ دیا گیا، اللہ کرے وہاں کے مسلمان اب بھی اس پر غور وفکر کریں۔

جنسی ہیجان خیزی کی نفسیات
فکر مندی کی ضرورت

اس دور کا بڑا فتنہ جنسی ہیجان خیزی کی نفسیات ہے، جس نے دنیا بھر کے انسانوں کو اپنی گرفت میں لیا ہے، یہ نفسیات، نفس، شیطان اور مادیت پرست قوتوں کے غلبے کا نتیجہ ہے، سوشل میڈیا نے اس نفسیات میں جلتی پر تیل کا کام کرکے، اسے مذہب سے وابستہ لوگوں تک پہنچایا ہے۔

اس لئے کہ سوشل میڈیا نے بے لاگ جنسی واردات کی عکس ریزی کرکے مرد وعورت کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے، مخلوط تعلیمی نظام نے بھی جنسی ہیجان خیزی کے رجحان کو تقویت دی ہے، سوشل میڈیا پر بعض مسلمان نما مرد اور عورتوں کے پروگرام دیکھیں تو وہ کھلم کھلا جنسی بے راہ روی کی تعلیم دیتے ہیں، انہیں اس سلسلے میں نہ تو اپنی مسلمانیت کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی شرم وحیا آتی ہے کہ وہ یہ کام کرکے کتنا گھناؤنا کردار ادا کرتے ہیں، نفس کی قوتیں جب غالب آتی ہیں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ فرد شرم وحیا سے محروم ہوجاتا ہے، حدیث شریف ہے کہ جس میں حیا نہیں ہے وہ جو چاہے کرے، جنسی آزادی اور جنسی ہیجان خیزی کی نفسیات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہر طرح کی نیکیوں کی توفیق سلب ہونے لگتی ہے، اس کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ذہن ہر وقت گندے خیالات کا مرکز بنا رہتا ہے، تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے افراد اور ایسی قوموں کی ذہنی اور جسمانی توانیاں بُری طرح متاثر ہوتی ہیں، وہ نہ تو فکری تخلیق کے قابل رہتی ہیں اور نہ ہی عملی کام کے لائق۔ واضح ہو کہ مغرب نے ایسا نظام تشکیل دیا ہے، جس کے تحت دنیا بھر کے علوم وفنون کے ماہرین کھنچ کر وہاں چلے جاتے ہیں، اور مغرب کو تلاش وتحقیق کے لئے نیا خون مل جاتا ہے، اس

طرح اہل مغرب کی عیاشی اور سہولت پسندی کی وجہ سے ان کے زوال کی روک تھام کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

جنسی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے، اس فطری تقاضے کی تسکین کی صورت شادی کے رشتہ میں منسلک ہونے سے وابستہ ہے، اسلام کی تعلیم یہی ہے، فطرت میں موجود جنسی تقاضے کے دو مقاصد ہیں، ایک یہ کہ انسانی نسل کا تسلسل قائم رہے اور خاندانی نظام مستحکم رہے خاندانی نظام شادی کے ذریعہ ہی قائم رہ سکتا ہے۔

دوسرا مقصد مرد و عورت کے جذباتِ محبت کی تسکین ہے، اس لئے اللہ نے میاں بیوی کے درمیاں محبت کا نازک تعلق قائم رکھا ہے، لیکن جب جنسی اشتعال کی نفسیات پیدا ہوتی ہے تو فرد جنسیاتی مریض بن جاتا ہے، موجودہ دور میں سوشل میڈیا کے ذریعے جو جنسی مناظر و مظاہر دکھائے جاتے ہیں، وہ ایسے ہیں، جس سے بے ضرر انسان کے جنسی جذبات بھی مشتعل ہو جاتے ہیں اور ذہن کی پاکیزہ ہونے کے بجائے ذہن گندہ خیالات کا مرکز بن جاتا ہے، اس طرح جنسی اشتعال کی نفسیات سے انسان حیوانیت کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔

چونکہ اہل مغرب کے ہاں جنسی جذبات کی تسکین کے لئے شادی کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے، فرائیڈ کے نظریے کے تحت اس جذبے کو روکنے کے نتیجے میں ذہنی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس لئے جنسی تعلق قائم کرنے کے لئے کوئی قانونی اور معاشرتی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اہل مغرب نے فرائیڈ کے اس نظریے کو شعوری طور پر اختیار کر لیا ہے، اس لئے وہاں جنسی آزادی کے نام سے شرمناک حرکتیں ہوتی رہتی ہیں اور مرد و عورت کے جنسی میلاپ کو نہ صرف یہ کہ بُرا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ماں باپ اپنے بچوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ جنسی عمل کے لئے اپنا دوست خود ہی منتخب کر لیں۔

اہل مغرب میں جنسی آزادی اور بے لاگ جنسی عمل ان کی تہذیب کا حصہ بن چکا ہے مغرب لگ بھگ تین سو سال سے جنسی آزادی کی اس راہ پر گامزن ہے، جس کی وجہ سے جنسی اشتعال کی نفسیات وہاں عام ہے، وہاں، عفت اور عصمت کا تصور بھی نہیں ہے۔

معاشرے میں مذہب کی گرفت جتنی کمزور ہو گی، جنسی ہیجان خیزی کی نفسیات اسی مناسبت سے بڑھتی جائے گی، مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی نسلیں تیزی سے فرائیڈ کے اس نظریے کی حامل ہوتی جارہی ہیں کہ انسان کی تخلیق میں سب سے طاقتور نصب العینی داعیہ جنسی جذبہ ہی ہے، یہ مغرب کے طاقتور مادہ پرست ماحول میں رہنے کا لازمی نتیجہ ہے، مغرب میں جنسی ہنگامہ خیزی اور آزاد جنسی عمل کے رجحانات و میلات سیلاب کی طرح طاقتور ہیں، جس میں لوگ خش و خاشاک کی طرح بہتے جارہے ہیں۔

مادیت پرستی کے جدید آلات نے ایسی صورتحال پیدا کر دی ہے کہ اب ہماری نسلیں اہل مغرب کے دیکھا دیکھی تیزی سے آزاد جنسی عمل کی راہ کی طرف جارہی ہیں، اس سلسلے میں ہمیں اپنی نسلوں کی سب سے زیادہ فکر کرنی چاہئے۔

یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو ذہنی اور جسمانی توانائیاں رکھی ہیں، ان کا ایک ہدف و مقصد یہ ہے کہ ان توانائیوں سے کام لے کر فرد اللہ کے ساتھ اپنی محبت کے ارتقائی مراحل طے کرے، اور اس کے لئے مجاہدوں سے کام لے، البتہ ان توانائیوں کا ایک حصہ جائز جنسی تقاضوں میں صرف کیا جائے تاکہ جہاں انسان کے مادی جذبات حسن کی تسکین ہو سکے، وہاں انسانی نسل کا تسلسل بھی قائم رہ سکے۔

سمیہ اسلام

وقت کے صحیح استعمال کے بنیادی اصول

ورکنگ ویمن کے لیے ٹائم مینجمنٹ ایک اہم عنصر ہے جو نہ صرف ان کی پروڈکٹیوٹی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی سکون اور توازن برقرار رکھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ آج کے تیز رفتار دور میں، جب کام کی ذمہ داریاں اور ذاتی زندگی کے تقاضے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں، مناسب ٹائم مینجمنٹ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ورکنگ ویمن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال کریں تاکہ وہ اپنی روزمرہ کی تمام ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا سکیں اور ساتھ ہی اپنے ذاتی وقت کی قدر بھی کر سکیں۔ صحیح منصوبہ بندی اور تنظیم کے ذریعے، وہ نہ صرف کام کی جگہ پر کامیاب ہو سکتی ہیں بلکہ اپنے ذاتی اہداف کو بھی حاصل کر سکتی ہیں۔

ٹائم مینجمنٹ کے سنہری اصول ورکنگ ویمن کو اپنے کام اور ذاتی زندگی کے بیچ ایک مضبوط توازن قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ جب آپ اپنے وقت کی بہتر منصوبہ بندی کرتی ہیں تو آپ کام کے دباؤ کو کم کر سکتی ہیں اور اپنی توانائی کو صحیح طریقے سے خرچ کر سکتی ہیں۔ ان اصولوں کی مدد سے ورکنگ ویمن اپنے دن کو مؤثر طریقے سے ترتیب دے سکتی ہیں، اہم کاموں کو ترجیح دے سکتی ہیں، اور غیر ضروری سرگرمیوں سے بچ سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ، ٹائم مینجمنٹ کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ آپ کو ذہنی سکون فراہم کرتا ہے کیونکہ آپ جانتی ہیں کہ آپ نے اپنے کاموں کو ترتیب سے کیا ہے اور آپ کے پاس وقت ہے اپنے ذاتی امور کو بھی مکمل کرنے کے لیے۔ انسان کو زندگی میں حاصل ہونے والی کوئی کامیابی وقت کی پابندی

کے بغیر ممکن نہیں، اگر آپ اپنی زندگی میں مختلف کاموں کو کل کروں گا یا کروں گی پر ٹالنے والے شخص ہیں تو آپ کا طرز زندگی تبدیلی مطالبہ کر رہا ہے اور وہ تبدیلی ٹائم مینجمنٹ ہے۔

گھر میں بچے ہوں تو ماؤں کے لیے چیزیں ترتیب دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ بچوں کو دیکھنا، ان کے کھانے پینے اور ضروریات کا خیال رکھنا ماؤں کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ بچوں کی موجودگی میں آئے دن افراتفری کا سامنا رہتا ہے، تاہم چند باتوں پر عمل پیرا ہو کر ورکنگ مائیں اپنے وقت کا زیادہ بہتر اور زیادہ موثر استعمال یقینی بنا سکتی ہیں۔ آپ کو سپر موم بننے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ہر کام آپ کو خود ہی کرنا ہے۔ جب آپ وقت کی کمی کا شکار ہوں تو دیگر وسائل استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ورکنگ ویمن کے لیے ٹائم مینجمنٹ کے سنہری اصول نہ صرف کام کے حوالے سے کارکردگی بڑھانے میں مدد دیتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آیئے ان اصولوں پر مزید تفصیل سے بات کرتے ہیں:

ا۔ پلاننگ اور ترجیحات کا تعین کریں

روزانہ کی منصوبہ بندی: ہر روز کا آغاز ایک اچھے پلان کے ساتھ کریں۔ اپنے کاموں کو تحریر کریں اور ان کو ترجیحات کی بنیاد پر ترتیب دیں۔ ایسے کام جو فوراً کرنے ضروری ہوں، ان کو سب سے پہلے نمٹائیں۔

ہفتہ وار منصوبہ بندی: ہفتہ کے آغاز میں اپنی ہفتہ بھر کی منصوبہ بندی کریں، تاکہ آپ کو پورے ہفتے کا کام پیشگی پتہ ہو اور آپ کسی بھی کام کو آخری لمحے پر نہ چھوڑیں۔

ٹاسک کی درجہ بندی: آپ کاموں کو تین اقسام میں تقسیم کر سکتی ہیں:

ضروری کام (جیسے کسی پروجیکٹ کی ڈیڈ لائن)۔

اوسط اہمیت کے کام (جیسے روزانہ کی ای میلز یا چھوٹے انتظامی کام)۔

۲۔ ٹاسک کو مختلف حصوں میں تقسیم کریں

جب آپ کو کوئی بڑا اور پیچیدہ کام سونپا جائے تو اسے چھوٹے حصوں میں تقسیم کریں تاکہ ہر ایک حصے پر توجہ مرکوز کی جا سکے۔

ٹائم بلاکنگ تکنیک: ایک مخصوص وقت میں ایک کام پر کام کرنے کے لیے اپنے دن کو بلاک کریں۔ مثلاً، ۹ بجےالک ای ر حتمیلز پیر کرنا اور ۱۱ سے ۱ بجے تک پروجیکٹ پر کام کرنا۔

ہر چھوٹے حصے کو مکمل کرنے کے بعد خود کو چھوٹا انعام دیں تاکہ آپ کا موٹیویشن برقرار رہے۔

۳۔ مؤثر کام کا ماحول بنائیں

کام کی جگہ کی تنظیم: آپ کی کام کی جگہ پر سب کچھ منظم اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ ایک بے ترتیب اور گندا ماحول ذہنی دباؤ پیدا کرتا ہے۔

ڈیسک آرگنائزر استعمال کریں: اہم کاغذات یا چیزوں کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں تاکہ آپ کو بار بار ان کی تلاش نہ کرنی پڑے۔

۴۔ ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھائیں

موبائل ایپلیکیشنز: مختلف ٹائم مینجمنٹ ایپلیکیشنز کا استعمال کریں، جیسے کہ:

Google Calendar: اپنے کاموں کا شیڈول بنانے کے لیے۔

یاددہانی: اپنے کاموں کی یاددہانی کے لیے ایپلیکیشنز کا استعمال کریں تاکہ آپ کوئی کام بھول نہ جائیں۔

۵۔ دھیان مرکوز رکھیں (Focus)

غیر ضروری چیزوں سے بچیں: سوشل میڈیا، موبائل فون،ای میل حیک پیر کرنا آپ کی کارکردگی کو کم کر سکتا ہے۔ اپنے کام کے دوران ان سے دور رہنے کی کوشش کریں۔

سیٹ ڈیڈلائنز: ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کریں، اور اس وقت میں ہی کام مکمل کرنے کی کوشش کریں تاکہ آپ اپنے دھیان کو اس کام پر مرکوز رکھ سکیں۔

اپنے وقت کو پروڈکٹیو بنائیں: خود کو جانیں اور یہ سمجھیں کہ آپ کس وقت زیادہ فوکس ہو کر کام کر سکتی ہیں۔ اگر آپ کا دماغ صبح سویرے عموماً تیز چلتا ہے تو اہم کام صبح کے اوقات میں کریں۔

٦۔ 'نہیں' کہنا سیکھیں

کام کی اوورلوڈنگ سے بچیں: اگر آپ کے پاس کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے تو نئے کاموں کو لینے سے انکار کریں یا ان پر بعد میں کام کرنے کا وعدہ کریں۔

اچھے انداز میں جواب دیں: جب آپ کو کسی کام کی درخواست کی جاتی ہے، تو فوری طور پر جواب نہ دیں۔ اگر آپ کو لگے کہ آپ اس کام کو اچھے طریقے سے نہیں کر پائیں گی تو آپ اس سے مؤدب طریقے سے انکار کر سکتی ہیں۔

وقت کی قدر کریں: آپ کا وقت قیمتی ہے، اور آپ کو اس کا صحیح استعمال کرنا سیکھنا ہوگا۔

۷۔ آرام کا وقت مختص کریں

آرام کیلئے وقت نکالیں: اپنے دن میں کم از کم ۱۵۔۲۰ منٹ کا وقفہ ضرور رکھیں تاکہ آپ ذہنی سکون حاصل کر سکیں۔

نیند کی اہمیت: اچھی نیند آپ کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر آپ کم نیند لیں گی تو آپ کی پروڈکٹیویٹی متاثر ہوگی۔

مولانا عبدالمتین

سنی سنائی بات کی تحقیق کرنا

سورت الحجرات کی آیت نمبر 6 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔

اے ایمان والوں ! اگر کوئی کچی بات لانے والا تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو، اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

سورہ کا تعارف

سورہ حجرات کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بہت اہم اور نازک معاملے سے متعلق متوجہ فرمایا ہے۔ سورہ حجرات میں اللہ رب العزت کچھ ایسے اصولوں کو بیان فرماتے ہیں جن کا اسلامی معاشرت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اگر ان اصولوں کو مد نظر رکھا جائے تو نہایت خوب صورت اور پاکیزہ معاشرے کی فضا ہموار ہو سکے۔

1۔ان میں سب سے پہلا اصول یہ بیان فرمایا کہ معاشرے کا دستور قرآن وسنت کو ہونا چاہیے۔

2۔اس دستور کو صرف زبانی حد تک نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہونا ہے۔

3۔اس سورہ کے تیسرے اہم اصول کے متعلق یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بھی معاملے سے متعلق پہلے بھرپور تحقیق سے کام لیا جائے چاہے وہ معاملہ دینی ہو یا دنیوی، گھریلو، دفتری، انتظامی، سیاسی ہو یا آپس کے تعلقات سے متعلق، الغرض کوئی بھی ایسی بات پتہ چلے تو

جب تک مکمل تحقیق نہ ہو جائے بات مکمل واضح نہ ہو جائے تب تک اس پر نہ یقین کرو نہ عمل کرو نہ ہی اس حوالے سے کوئی ایکشن لو۔

دور حاضر کی نزاکت

موجودہ زمانے سے اس اصول کا بہت گہرا تعلق ہے، سوشل میڈیا کا زمانہ ہے جس میں ہر طرف سے خبریں آ رہی ہیں ہر طرف سے معلومات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں تو ایسے موقع پر بڑی نزاکت کے ساتھ ان چیزوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

بات کرنے والا کون ہے ؟

لہذا سب سے پہلے اس بات کا جاننا ضروری ہے کے جو شخص بات کر رہا ہے وہ خود کیسا ہے، اس کے اپنے اندر کتنی سچائی ہے، اس کا کردار واخلاق کیسا ہے، کہیں وہ کوئی مشکوک یا کمزور کردار کا مالک تو نہیں، ایسا تو نہیں کہ وہ جہاں کہیں سے جیسی تیسی ادھوری بات سن لیتا ہے تو فورا آگے پھیلا دیتا ہے۔

آپس کے تعلقات میں رنجشیں کیسے پیدا ہوتی ہیں ؟

عام طور پر آپس کے تعلقات میں جو رنجشیں پیدا ہوتی ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ہر سنی سنائی بات پر فوری یقین کرنا ہے مثلا کوئی شخص آئے اور کہے کہ " آپ کو پتہ ہے فلاں شخص آپ کے متعلق اس طرح کہ رہا تھا" اس جملے سے بظاہر یوں لگتا ہے کہ ایک مخلص دوست کی پرواہ کی جا رہی ہے لیکن ذرا سا غور کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس بات کے پہنچانے میں اس شخص کے بہت سے اپنے مفادات ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے اسے اپنا کوئی کام نکالنا ہو اور جھوٹی ہمدردی کا ڈھونگ رچا رہا ہو اور اپنے مقصد کی خاطر جھوٹ کہہ رہا ہو۔

یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات بہت چھوٹی سی ہوتی ہے بتانے والا اس چھوٹی بات کو اپنے مقصد کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور من پسند نتائج نکال کر

ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور یہ باتوں باتوں میں ایسا بھی کہہ دیتا ہے کہ "میں آپ کو دوستی یاری میں یہ سب بتا تو رہا ہوں لیکن خیال رکھنا میرا نام نہ آئے"۔ گویا یہ آگ بھی جلاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میرا نام نہ آئے تاکہ بات اگر بگڑ جائے تو مجھ پر حرف نہ آئے بلکہ یہ اکیلے ہی نمٹے، بالآخر یہ صاحب بعد میں انجان بن کر لاعلمی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے مسائل یا غبارے

ایسے موقع پر ہم جذبات میں آکر اس کی بات کا یقین کر لیتے ہیں یہ سوچ کر کہ یہ میرے ساتھ مخلص ہے، میرے حق میں بات کر رہا ہے، میرا ہمدرد ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ معاملہ ریت کے ذرے برابر تھا جسے پہاڑ بنا کر میرے سامنے پیش کیا گیا، ٹھیک ایسے ہی جیسے غبارے ہوتے ہیں جو اپنے ظاہر میں بہت موٹے تازے چمکدار اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ایک سوئی کی چبھن سے ڈھیر ہو جاتے ہیں، اسی طرح کچھ معاملات بہت بڑے اور خطرناک معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک تحقیق اور تفتیش کا عمل ساری قلعی کھول دیتا ہے کہ تم سے کیا کہا جا رہا تھا اور حقیقت کیا کچھ ہے۔

غیبت کرنے والے کی عجیب کمزوری

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات ذکر فرمائی کہ "جو شخص آپ کے پاس آکر کسی کی غیبت کرتا ہے کسی کا براتذکرہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کے پاس جا کر آپ کا بھی براتذکرہ کرتا ہوگا" کیونکہ اس کے اندر ایسا مرض موجود ہے جسے یہ اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ آپ کو بظاہر ہوں لگتا ہے کہ یہ تو میرے ساتھ ہے لیکن مجلس برخاست ہوتے ہی وہ کسی اور کے ساتھ ہو جاتا ہے اور وہاں پر آپ کی ذات کو موضوع بناتا ہے۔

جلد بازی میں فیصلہ کرنے کے نقصانات

اللہ رب العزت نے ایسے لوگوں سے متعلق یہ حکم بیان فرمایا کہ اگر کبھی ایسا ہو جا ہے کہ آپ کے پاس کوئی کچا آدمی آجائے اور کوئی بات بتائے تو فوراً اس کی بات پر یقین مت کرنا بلکہ پہلے خوب تحقیق سے کام لینا اور بات کو مستند ذرائع سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ تحقیق سے بات معلوم ہو جائے تو ٹھیک وگرنہ جلد بازی میں کوئی قدم مت اٹھانا کیونکہ بغیر تحقیق کے کوئی بھی قدم اٹھانا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں یہ کہنا پڑے کہ "کاش میں فلاں کی باتوں میں نہ آتا" ، "پہلے بات کی تصدیق کر دیتا" وغیرہ۔

گھریلو ناچاقیاں

اسی طرح گھریلو زندگی میں جہاں بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں ظاہر ہے جب کچھ لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں تو انسانی طبیعت کے مختلف ہونے کی وجہ سے کافی معاملات پیش آسکتے ہیں تبھی علماء فرماتے ہیں گھریلو زندگی احسان کے اصول کو اپنائے بغیر نہیں گزاری جاسکتی لہذا اگر کوئی شخص ہر چھوٹی موٹی بات کا بدلہ لینا شروع کر دے، ہر وقت گھر والوں کے رویوں کا باتوں کا گلہ کرنے لگے تو زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور سکون ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پاتا مثلاً گھر میں زبان سے کسی کے بارے میں کوئی بات نکل جاتی ہے لیکن سننے والا اس بات کو بنا سنوار کر آگے بتا دیتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ تو آپ کے بارے میں ایسا کچھ کہہ رہا تھا، فلاں کے سامنے آپکا نام آیا تو اس نے اس طرح کا منہ بنایا، ناگواری دکھائی، آپ کی یہ چیز اٹھا کر لے گیا، آپ کی کمائی یا کھانے پینے پر ایسا ایسا کہا گیا وغیرہ وغیرہ۔

اصولی بات

ایسے تمام معاملات کی صورت ایک اصول یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جو مجھے یہ سب بتا رہا ہے وہ خود کیسا ہے، اس کی بات میں کتنا وزن ہے، اس کی بات کا یقین کیا جائے یا نہیں،

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہر جگہ یہی کرتا ہے جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر کسی کے پاس جا کر کوئی نہ کوئی ایسی گرما گرم بات ضرور کر دیتے ہیں کہ فلاں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا، فلاں نے یہ کیا، فلاں علاقے میں یہ ہوا۔ ایسے لوگ نیوز رپورٹر کی طرح ہر ایک کے پاس خبریں پہنچاتے رہتے ہیں جو در حقیقت سنجیدگی سے سننے کے لائق ہی نہیں ہیں نہ ہی اعتبار کے قابل ہیں۔

میاں بیوی کا عجیب واقعہ

ایک مرتبہ شوہر کو اپنی بیوی پر شک ہو گیا کہ تم حاملہ ہو لیکن یہ میری اولاد نہیں ہے بلکہ کسی اور کی اولاد ہے تو اس کی اہلیہ نے کہا کہ ایسا کرتے ہیں کہ ٹیسٹ کرواتے ہیں پھر معلوم ہو جائے گا کہ یہ اولاد آپ ہی کی ہے یا نہیں۔ جب ٹیسٹ کروایا تو رپورٹ کے مطابق ڈی این اے شوہر کا نہیں تھا بلکہ کسی اور کا تھا، شوہر نے بیوی کو کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں لیکن اسی وقت کاؤنٹر سے آواز آئی کہ ہم نے آپ کے ہاتھ غلط رپورٹ تھما دی تھی جب کہ آپ کی رپورٹ یہ ہے اور اس رپورٹ کے مطابق وہ اسکا اپنا ڈی این اے تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بہت سے گھریلو معاملات ہیں جن میں بڑی سختی اور جذباتیت کے ساتھ ہم قدم اٹھاتے ہیں لیکن کچھ ہی وقت میں ہمیں بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت پچھتاوا ہوتا ہے کہ کاش ہم پہلے اس بات کی تصدیق کرتے پھر اس کے بعد کوئی قدم اٹھاتے لیکن تب وقت ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔

جھوٹے شخص کی نشانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ "انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ جو بھی سنے بغیر تحقیق کے آگے بیان کر دے" (صحیح مسلم) ۔

یعنی ایسا شخص جس کی عادت ہے کہ سنتے ہی اگل دیتا ہے، سنتے ہی سب کو سنا دینا، یہ عادت ہی اس کے جھوٹا ہونے کی نشانی ہے۔

سوشل میڈیا اور سنی سنائی کی بھرمار

آج کل سوشل میڈیا اور ٹکنالوجی کا دور ہے ایک ہاتھ میں پوری دنیا کی خبریں آجاتی ہیں، لیکن اس بات کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ خبریں کہاں سے آرہی ہیں ان کا ذریعہ کیا ہے۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ کوئی کسی کے پاس کوئی حدیث بھیجتا ہے تو وہ فوراً سے یقین کر لیتا ہے اور دوسروں کو فارورڈ کر دیتا ہے جبکہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں حوالہ بھی درج ہے یا نہیں، سند کے اعتبار سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی بزرگ کا قول ہو اور اسے حدیث بنا دیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے حوالے سے ایسے کئی اقوال سوشل میڈیا پر آتے رہتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ ہو تو پہلے یہ تصدیق کرانی چاہیے کہ واقعی اس طرح کی کوئی آیت ہے بھی نہیں، ترجمہ درست ہے یا غلط۔

اس میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ ہر بات کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دینا، کسی صحابی سے منسوب کر دینا وغیرہ یہ رویہ ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

دینی باتوں کی نزاکت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح حدیث ہے کہ:

کسی نے مجھ سے منسوب کر کے کوئی ایسی بات کہی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرماتے ہیں اور میں نے ایسا نہ کہا ہو تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم سمجھ لے۔ (صحیح مسلم)

ایک مرتبہ میرے اپنے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک ساتھی نے مسیج بھیجا جس میں سورہ ملک کا ترجمہ لکھا ہوا تھا جو بالکل غلط تھا یہاں تک کہ اس میں سورہ ملک کی کسی ایک آیت کا بھی ترجمہ نہیں تھا لیکن عنوان یہی لگایا ہوا تھا۔

ایک صاحب نے واقعہ سنایا کہ

کچھ برس پہلے انہوں نے انٹرنیٹ پر بہت سی دینی کتابیں سرچ کرنا شروع کیں تو ایک ویب سائٹ جو کہ "الاسلام", کے نام سے بنی ہوئی تھی، انہیں لگا کہ اس میں بہت سی اچھی کتابیں ہیں اور وہ خوب مطالعہ کرنے لگے مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پوری ویب سائٹ ہی قادیانیوں کی ہے جو آج بھی موجود ہے۔ جسے اگر کوئی عام مسلمان بغیر تحقیق کے پڑھنا شروع کرے تو ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

لہٰذا ایسے معاملے میں علماء اور اہل علم سے تحقیق کرنی چاہیے کہ یہ صحیح بھی یا نہیں، یہ جو مسئلہ سننے کو ملا ہے یہ واقعی دین کا مسئلہ ہے یا نہیں۔

قرآن کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

اس قرآن کے ذریعے لوگ ہدایت بھی پاتے ہیں اور گمراہ بھی ہوتے ہیں۔ (بقرہ)

خلاصہ

معلوم ہوا کہ کوئی بھی بات چاہے دین کے حوالے سے ہو یا گھریلو حوالے سے، آپس کے تعلقات ہوں یا معاشرے کے اتار چڑھاؤ پہلے تحقیق کرنا ہم پر لازم ہے۔

خاص طور پر جب بات دین کے حوالے سے ہے تو جو بات کو بیان کرنے والا ہے وہ کوئی مستند عالم بھی ہے؟ اس نے جہاں سے تعلیم حاصل کی ہے وہ مستند ادارہ ہے؟ دین اتنا سستا نہیں کہ کوئی بھی کیمرے کے سامنے بیٹھ کر فتوے جھاڑنے لگے، کچھ ویڈیوز دیکھ کر عقیدہ نہیں سمجھا جا سکتا، ہزاروں علماء سے بدظن ہو کر ہم سوشل میڈیا کے قریب ہو سکتے ہیں لیکن دین کے نہیں۔

تحریر: ڈاکٹر فرح ناز

اسلام میں سادہ طرز زندگی کا تصور

دینی تعلیمات کی روشنی میں سادگی کے تصور کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا انتہائی اہم ہے۔ سادگی کے تصور کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا دین کی اصل روح کے مطابق جینے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ سادگی کا طلب یہ ہر گز نہیں کہ ہم اپنے لباس یا ظاہری شکل کو اس حد تک تبدیل کر لیں کہ وہ موجودہ نسل کے لیے غیر موزوں یا ناقابل قبول ہو جائے۔ اس کے برعکس سادگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اتنی اعتدال پسندی اختیار کریں کہ ہم اپنے معاشرتی اور ثقافتی ماحول سے ہم آہنگ رہیں۔ اس سے نہ صرف ہماری شخصیت میں نکھار آتا ہے، بلکہ دین کی تعلیمات کی حقیقی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ سادگی کو اپنانے سے ہم معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں اور دین کو صحیح انداز میں سمجھ کر ایک مضبوط، جائز اور قابل عمل راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمارے اور معاشرتی ترقی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مذہبی طبقات کے رہن سہن کا روایتی مذہبی تصور کہ دین اور دیندار بس غربت اور غریبی میں ہی رہے، سوسائٹی میں دین کی قبولیت میں رکاوٹ کھڑی کی ہے۔ اس روایتی تصور نے دین کو ہمارے خطے کے اہل ثروت لوگوں میں قابل قبول نہیں رہنے دیا۔ اس تصور نے دیندار کو اتنا احقر، غریب، کسم پرسی، معاشرے سے ہٹ کر کوئی اور مخلوق بنا لیا ہے جس کے مطابق گویا دین سے متعلق لوگوں کو دنیا سے الگ تھلک ہو کر محتاج اور دست نگر ہونا چاہئے۔ جس کسی دینی شخصیت نے اگر اپنی صلاحتوں کی بنا پر جائز طریقے سے حلال مال کمایا یا ہماری سوسائٹی اسکو کرپٹ مشہور کرنے کی ذمہ داری ادا کرنا اپنا اہم فریضہ سمجھتی ہے۔ یہ مشہور کرنا کہ یہ نذرانوں سے بنا یہ محبین اور عاشقین کے تحائف اور چندوں سے بنا اسلامی تعلیمات کے برعکس ہے۔ ہمارے ائمہ کرام میں سے امام اعظم امام ابو حنیفہ کے

کاروبار سے سب واقف ہیں۔ بلکہ بہت سے ائمہ کے القابات ان کی علمی و تحقیقی کاوشوں کے بجائے ان کے کاروبار کی نسبت سے مشہور ہیں۔ عصر حاضر میں J. اور دیگر برینڈ بھی اسی طرض سے مشہور ہیں۔ لہٰذا کسی مسلم دینی شخصیت کو محض دین کی خدمت کی بناپر مورد الزام ٹھہرانا ہر گز معقول بات نہیں۔

حقیقی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں باوقار لباس اور عمدہ رہن سہن اختیار کرنا ہر گز سادگی کے تصور کے خلاف نہیں ہے۔ سورہ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (سورۃ آل عمران، آیت ۳۲)

''فرمادیجیے: اللہ کی اس زینت (وآرائش) کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمائی ہے اور کھانے کی پاک ستھری چیزوں کو (بھی کس نے حرام کیا ہے)؟ فرمادیجیے: یہ (سب نعمتیں جو) اہل ایمان کی دنیا کی زندگی میں (بالعموم روا) ہیں قیامت کے دن بالخصوص (انہی کے لیے) ہوں گی۔ اس طرح ہم جاننے والوں کے لیے آیتیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔''

اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی زینتوں اور نعمتوں کو حرام کرنا کوئی جائز بات نہیں۔ اللہ کی طرف سے ہر وہ چیز جو جائز ہو، اس کا استعمال کرنا انسان کی فطرت کے مطابق ہے۔ تاہم، اس کا استعمال اعتدال کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ دنیا کی لذتیں انسان کو اس حد تک نہ بہکالیں کہ وہ اپنی آخرت اور دین کو نظر انداز کردے۔

اللہ نے دنیا میں جو نعمتیں اور آرائشیں انسانوں کے لیے تخلیق کی ہیں، وہ دراصل ایمان والوں کے لیے ہیں۔ ان کے استعمال سے انسان کی زندگی میں خوبصورتی، رونق اور خوشبو آتی ہے، اچھا لباس، زیورات، خوشبو اور دیگر دنیوی راحتوں اور نعمتوں کا استعمال کسی صورت حرام

نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت سے انسانوں کے لیے پیدا کیا تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو بہتر، خوشحال اور متوازن بنا سکیں۔

یہ حسین و جمیل چیزیں صرف دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں تاکہ وہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی میں سکون، خوشی اور توازن پیدا کر سکیں۔ تاہم ان چیزوں کی محبت میں اس حد تک غرق نہ ہو جائیں کہ دنیا کی فانی آرائشوں کے پیچھے آخرت کی حقیقت اور اہمیت بھلا دیں۔ دین کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر چیز میں اعتدال اور توازن اختیار کرے، تاکہ وہ اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارے۔

لہٰذا لباس اور رہن سہن کی عمدگی کو حرام کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ سب ایمان والوں کے لیے اللہ کی طرف سے ایک انعام ہیں، جنہیں ان کی فطرت کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔ ان چیزوں کا صحیح اور معتدل استعمال انسان کی زندگی کو بہتر بناتا ہے اور اللہ کی رضا کی جانب رہنمائی کرتا ہے، بشرطیکہ ان کا استعمال تقدیر کے مطابق ہو، اور انسان کا دل اللہ کی طرف مائل رہے۔

اسلاف کی عمدہ رہن سہن اور قیمتی لباس

ہمارے اسلاف نے جن کے شب و روز خدمت دین میں گزرتے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا قال اللہ و قال الرسول تھا اور رہتی دنیا تک جن کی تقلید و اتباع ہوتی رہے گی وہ بھی عمدہ رہن سہن اپناتے اور اچھا لباس زیب تن کرتے تھے۔ غربت اور کسمپرسی کی حالت کو دیندار سے نتھی کرنا کسی طرح بھی دینی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ معاشرے کے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رزق حلال کمائے اور ضروریات پر خرچ بھی کرے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا اظہار بھی جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (سورۃ الضحیٰ: آیت ۱۱)

'' اور اپنے رب کی نعمتوں کا (خوب) تذکرہ کریں۔''

حضور علیہ السلام نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُحِبُّ أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَى عَبْدِهِ۔

(مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر 7759)

''اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو نعمت عطا کرے تو اسراف و مبالغہ کے بغیر اس کا اظہار جائز ہے۔ شرط یہ ہے کہ مقصود اظہار نعمت اور شکر گزاری ہو نا کہ تکبر۔ تاریخ اسلام میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ ہمارے اسلاف عبادت کے لئے عمدہ اور قیمتی لباس کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

حضرت تمیم الداری رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ آپ تو عمدہ کپڑے پہن لیتے تھے۔ آپ نے چار ہزار درہم کا ایک مہنگا اور عمدہ لباس خرید کر رکھا ہوا تھا۔ ماہ رمضان المبارک کی جس رات لیلۃ القدر کا گمان ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ اسی لباس کو پہنتے اور پوری رات ذکر و عبادت میں گزار دیتے تھے۔ (ابن ابی الدنیا، التہجد و قیام اللیل، ص، 372 الرقم/333)

امام ذہبی لکھتے ہیں: حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ بن علی ابن طالب سردیوں میں پچاس دینار کا کپڑا خرید کر لباس بناتے اور پھر گرمیوں میں اس کو صدقہ کر دیتے گرمیوں میں مصری کپڑوں میں سے خرید کر لباس بناتے۔ (الذہبی، سیر اعلام النبلاء، 398/4)

سیرت نگاروں نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قیمتی لباس کا ذکر کیا ہے جس کی قیمت 1500 درہم تھی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت میں آتا ہے کہ آپ حدیث کی تعلیم کے دوان عمدہ اور قیمتی لباس زیب تن کرتے تھے۔

اسی طرح پہلے زمانے میں ہمارے ائمہ سادگی کے باوجود وقت کے تقاضوں کے مطابق

بہتر لباس اور عمدہ رہائش کا انتظام کرتے تاکہ دین کا وقار قائم رہے۔ ان کے اس عمل پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اب جبکہ زمانہ بدل چکا ہے سائنس کی ترقی کی بدولت لوگوں کو ہر آسائش میسر ہے لوگ اپنی رہائش کے ساتھ ساتھ مساجدوں کی تعمیرات پر بھی خطیر رقم خرچ کرتے ہیں۔ حرمین شریفین اور دنیا کی دیگر بہت سی مساجد اس کی مثال ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کی دعوت و تبلیغ کرنے والے افراد اپنے ظاہر میں بھی ہر لحاظ سے بارعب، پرکشش اور قابل قبول ہوں تاکہ لوگ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر دین کی طرف راغب ہوں۔ لہٰذا زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لباس اور رہن سہن کو باوقار بنانا چاہیے تاکہ دین کو ہر دور کی ہر سطح اور ہر سوسائٹی کے لئے قابل قبول اور محبوب بنایا جا سکے۔

ضروریات زندگی کی تقسیم

ہماری ضروریات تین سطحوں پر مشتمل ہیں:

ا۔ بنیادی ضروریات (Basic Needs)

یہ ضروریات ہیں جو زندگی کی بقاء کے لیے لازمی ہیں، جیسے کھانا، پینا اور صحت کی سہولتیں۔

۲۔ عملی ضروریات (Functional Needs)

یہ ضروریات وہ ہیں جو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اہم ہیں، جیسے تعلیم، روزگار اور معاشی استحکام۔

حسی ضروریات (Aesthetic)

یہ دو چیزیں ہیں جو جمالیاتی سکون اور خوشی دیتی ہیں، جیسے خوبصورت لباس، خوشبو اور فنون۔

رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں ضروریات میں توازن برقرار رکھا۔ آپ ﷺ کی

حیات مبارکہ ہمیں ان ضروریات کو حکمت اور برکت سے ساتھ پورا کرنے کی رہنمائی دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب خوشبو کو پسند کرتے تھے تو وہ محض ایک basic need یا Fundamental need نہیں تھی، بلکہ ایک aesthetic need تھی۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ دین میں صرف ضروریات زندگی ہی نہیں، بلکہ زندگی کی ہر سطح پر خوبصورتی، عمدگی، سلیقے اور شائستگی کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ مزید یہ کہ دین انسان کو ایک خوبصورت اور متوازن زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے، جہاں ذاتی اور سماجی زندگی میں سلیقہ، شائستگی اور ذوق کی اہمیت ہو تاکہ وہ اللہ کی رضا کی طرف قدم بڑھا سکے۔

دشمنانِ اسلام کا دین بے زاری کا منصوبہ

دشمنانِ اسلام کا ایک بنیادی منصوبہ یہ ہے کہ دین اور دیندار کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ آج کا نوجوان دین سے بے زار ہو جائے اور اسے دنیاوی زندگی میں بے معنٰی اور irrelevant لگنے لگے۔ اس کے لیے وہ دین کے نمائندگان، دینی رہنماؤں اور علما کو ایک خاص انداز میں پیش کرتے ہیں، جو انتہائی کسمپرسی اور مفلسی کی حالت میں ہوں، تاکہ نئی نسل یہ تاثر لے کہ دین کا یا دور حاضر سے کوئی تعلق نہیں۔

دینی رہنماؤں کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے کہ ہم کس طرح اپنے کردار اور طرز زندگی کے ذریعے نوجوان نسل کو دین کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ دنیاوی حشمت اور عزت کا ہونا آج کے دور میں نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کی اہمیت بھی بڑھ چکی ہے۔ پچھلی دو دہائیوں میں دین کے نمائندگان کی جو تصویر ہمارے معاشرے میں سامنے آئی، وہ ایک غمگین حقیقت ہے۔ وہ حافظ جی یا مولوی صاحب، جن کے پاس دو وقت کا کھانا محلے کے گھروں سے اکٹھا ہوتا تھا، جن کے تن پر چند کپڑے اور زندگی کی تمام تر ضروریات عطیات پر منحصر تھیں، ان کی معاشی تنگی نے دین کی تصویر کو اس طرح پیش کیا کہ

نئی نسل نہ صرف دین سے دور ہوئی بلکہ اس کے بارے میں نفرت اور بیزاری کا بھی شکار ہو گئی۔

حاصل بحث

حاصل بحث یہ ہے کہ کیا دین کے نمائندگان کی تصویر دنیاوی شان و شوکت اور کامیابی سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟ کیا وہ افراد جو معاشی اور سماجی طور پر خوشحال ہیں، دین کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکتے؟ مرعوبیت کے اس دور میں ہمیں یہ سوال سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم دین کے حسن، جمال اور باوقار طرز زندگی کو کس طرح اپنائیں، تاکہ نوجوان نسل نہ صرف دین کو سچائی کا راستہ سمجھے، بلکہ اسے ایک قابل فخر اور باوقار طرز زندگی کے طور پر اپنائے۔

دنیاوی عزت اور کامیابی کو رد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ہمیں ان دونوں کو دین کی روح اور پیغامات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم دین کی اصل حقیقت کو اس طرح پیش کریں کہ وہ نہ صرف دلوں میں اُترے، بلکہ ایک خوشحال، باعزت اور فطری زندگی کا حصہ بن جائے۔ جب نوجوان نسل دین کے نمائندوں کو باوقار، خوشحال اور کامیاب دیکھے گی تو وہ خود بھی دین سے جڑنے اور اس کی تعلیمات کو اپنانے میں فخر محسوس کرے گی۔ نتیجتاً دین نہ صرف ان کے دلوں میں جگہ بنائے گا، بلکہ ایک عملی اور قابل فخر زندگی کا حصہ بن جائے گا۔

مولانا عصمت اللہ نظامانی

کتاب دوستی اور ہمارے اسلاف

اگر ہم اپنے اسلاف واکابرین کی زندگی اور سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو یہ بات ہم پر بالکل واضح وعیاں ہوگی کہ ہمارے اکابر علم سے محبت رکھنے والے اور کتاب دوست تھے۔ان کی زندگی کا محور کتاب ہوتی تھی، کتابیں پڑھنا، انہیں خریدنا، اور اپنے پاس جمع کرنا ان کا محبوب شغلہ ہوتا تھا، کتابوں کے حصول کے لیے مال خرچ کرنے سے ان کو راحت وسکون ملتا تھا، کتابوں کی درمیان بیٹھنا ان کے لیے پُر کیف ہوتا تھا، انہیں کتابوں سے انتہائی لگن تھی، جس کی بناپر ان میں کسی فرد کے پاس ایک لاکھ کتابیں ہوتی تھیں تو کسی کے پاس دو لاکھ کتابیں۔ کوئی راستے میں چلتے ہوئے بھی کتاب پڑھتا تھا، تو کوئی کتابوں کی محبت میں مفلس ومقروض ہوگیا۔ الغرض کتابوں کی مجلس میں ہی ان کے شب وروز گزرتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ علم میں کامل رسوخ حاصل ہوتا، اور بہترین استعداد واعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے، دین وملت کی رہنمائی کرتے، اور شاندار علمی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ذیل میں کتاب کی اہمیت وضرورت اور اسلاف واکابرین کے کتاب دوستی کے سلسلے میں واقعات وارشادات ذکر کیے جارہے ہیں، تاکہ ان کا مطالعہ کرنے سے ہمیں بھی کتابوں کا ذوق ہو۔

کتاب ایک بہترین دوست اور ساتھی

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہوگی کہ اچھی کتاب ایک دوست کا کام سرانجام دیتی ہے، جس سے آپ کامیابی کا راستہ، ہدایت کی راہ، اور ضرر ونقصان دہ چیزوں سے حفاظت کا طریقہ معلوم کرسکتے ہیں، ایک حقیقی دوست کی طرح مفید کتاب کبھی نقصان نہیں پہنچائے گی، اس

سے آپ ہمیشہ نفع اور بھلائی ہی پائیں گے، چنانچہ مشہور مؤرخ خطیب بغدادی (ت: ۴۶۲ھ) نے بھی ایک جگہ کتابوں کی تعریف وتوصیف بیان کرتے ہوئے، انہیں بہترین دوست اور عمدہ ساتھی قرار دیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''قلت: ومع ما فی الکتب من المنافع العمیمته والمفاخر العظیمته، فهی اکرم مال وانفس جمال، والکتاب آمن جلیس، واسر انیس، واسلم ندیم، وافصح کلیم۔''

ترجمہ: ''کتابوں میں موجود عمومی منافع اور بڑی قابل فخر چیزوں کے علاوہ، وہ بہترین مال اور انتہائی نفیس جمال وخوبصورتی ہیں۔ کتاب بہت پُر امن ہم مجلس ہے، بڑا راز دان دوست، سلامتی والا ساتھی اور انتہائی فصیح سخن گو ہے۔''

کتابیں علم کا ستون

کتابیں علم کا ستون ہیں، جس طرح عمارت کا ستون کے بغیر مضبوط وپائیدار ہونا مشکل ہے، اسی طرح کتابوں کے بغیر علم کا حصول واستحضار بھی بہت مشکل ہے۔ کتابوں کے ذریعے ہی علم میں رسوخ وپختگی حاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ علامہ ابن حزم نے بھی کتابوں کی کثرت کو علم کا ایک ستون شمار کیا ہے، اور پھر شاندار انداز میں کتاب کی ضرورت واہمیت اُجاگر کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ودعائم العلم مشهورة مستحکمته یؤ ثر بها العلم علی سائر اعراض الدنیا والاستکثار من الکتب، فلن یخلو کتاب من فائدة وزیادة علم یجدها فیه اذا احتاج الیها ولو لا الکتب لضاعت العلوم ولم توجد۔''

ترجمہ: علم کے ستون مشہور ومضبوط ہیں، جس کے سبب علم کو دنیا کی تمام چیزوں پر ترجیح دی جائے گی ان میں سے ایک ستون کتابوں کی کثرت ہے، کوئی کتاب فائدے اور علمی زیادتی سے ہرگز خالی نہیں ہوتی، جسے پڑھنے والا اس میں پائے گا، جب بھی اس کا محتاج ہوگا، پھر فرمایا کہ اگر کتابیں نہ ہوتیں تو علوم ضائع ہوجاتے اور ان کا وجود بھی نہ ہوتا۔''

کتابیں خریدنے کی لذت

جس شخص کو حصول علم کا شوق، اور کتابیں پڑھنے کا ذوق ہو، وہ کتابیں حاصل کرنے اور انہیں اپنے پاس جمع کرنے میں لذت محسوس کرے گا، اور کتابیں خریدنے کے لیے رقم خرچ کرنے میں فرحت و سرور محسوس کرے گا۔ علم کا حقیقی طالب وہی ہو سکتا ہے جو بڑے نشاط اور خوش دلی سے کتابوں پر اپنا مال صرف کرے۔ اس سلسلے میں مشہور عربی دان علامہ جاحظ (ت:۲۵۵ھ) نے کیا خوب بات کہی ہے:

''فالانسان لا یعلم حتی یکثر سماعہ ولا بد من ان تکون کتبہ اکثر من سماعہ ولا یعلم ولا یجمع العلم ولا یختلف الیہ حتی یکون الانفاق علیہ من مالہ الذ عندہ من الانفاق من مال عدوہ ومن لم تکن نفقتہ التی تخرج فی الکتب الذ عندہ من انفاق عشاق القیان والمستھترین بالبنیان لم یبلغ فی العلم مبلغا رضیا۔''

ترجمہ: ''یعنی کوئی شخص علم حاصل اور جمع نہیں کر سکتا، اور نہ اس کے پاس کوئی دوسرا علم کے لیے آسکتا ہے، یہاں تک کہ اس پر اپنا مال خرچ کرنا، دشمن کے مال میں سے خرچ کرنے سے بھی زیادہ مزیدار ہو، اور جس آدمی کو کتابوں پر لگایا ہوا خرچ، گلوکارہ باندیوں اور عمارتیں بنانے والے لاپرواہ افراد کے خرچ کرنے سے زیادہ لذیذ نہ ہو تو ایسا شخص علم میں کسی قابل قدر مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں سے بعض ایسے گزرے ہیں کہ تمام جمع پونجی کتابیں خریدنے میں لگا دیتے تھے، چنانچہ مشہور نحوی علامہ علی بن سیف الابیاری (ت:۸۱۴ھ) کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے:

وکلما حصل لہ شیء اشتری بہ کتبا۔''

ترجمہ: علامہ ابیاری کو جب بھی کوئی چیز حاصل ہوتی تو وہ اس کے بدلے کتابیں خرید لیتے۔''

کتاب دوستی کی ایک مثال: سفری لائبریری

کتاب بینی ایک ایسا فرحت بخش اور پُر لذت مشغلہ ہے کہ جس شخص کو اس کی عادت ہو جائے، اور مطالعہ کا چسکا لگ جائے، وہ ہر حالت میں اس عمدہ مشغلے سے لطف اندوز ہو گا، کتابیں پڑھ کر محظوظ ہو گا، یہی وجہ ہے کہ اکابرین اور اہل علم و دانش کی ایک جماعت کو اس کتاب بینی کی ایسی عادت تھی، اور علم میں اضافہ کا اتنا شوق تھا کہ وہ سفر و حضر ہر جگہ کتابیں اپنے ساتھ رکھتے۔ گھر میں مطالعہ میں انہماک کے باوجود اگر کبھی سفر درپیش ہوتا تو سفری لائبریری اپنے ساتھ لیے پھرتے، تھوڑا عرصہ بھی کتابوں سے جدائی گوارا نہیں تھی، چنانچہ مشہور و معروف عربی دان اور لغت کے امام علامہ مجد الدین فیروز آبادی (ت:۸۱۷ھ) کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ سفر میں بھی اپنے ساتھ کئی سواریوں پر کتابیں لے جاتے تھے، جیسا کہ علامہ سخاوی رقم طراز ہیں:

''وکان لا یسافر الا وصحبتہ منھا عدۃ احمال ویخرج اکثرھا فی کل منزلتہ فینظر فیھا ثم یعیدھا اذا ارتحلوہ۔''

ترجمہ: ''جب بھی وہ سفر کرتے تو ان کے ساتھ کئی گٹھڑیاں کتابوں کی ہوتیں، اور وہ ان میں سے اکثر ہر منزل پر نکال کر مطالعہ کرتے، جب لوگ وہاں سے کوچ کرنے لگتے تو وہ دوبارہ ان میں ڈال دیتے تھے۔''

اسی طرح اپنے ساتھ سفری لائبریری لے کر چلنے والوں میں سے ایک صلاح بن احمد مؤیدی (ت:۱۰۳۸ھ) ہیں، وہ کئی وقیع کتابوں کے مصنف اور اعلی استعداد والے علمائے کرام میں سے ایک تھے، کتابوں کے ساتھ انہیں خصوصی شغف تھا، چنانچہ علامہ شوکانی ان کی سفری لائبریری کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' واذا سافر اول ما تضرب خیمتہ الکتب واذا ضربت دخل الیھا ونشر الکتب والخدم یصلحون الخیم لاخری ولا یزال لیلہ جمیعہ ینظر فی العلم۔''

ترجمہ: ''جب وہ سفر کرتے تو سب سے پہلے کتابوں کا خیمہ گاڑھا جاتا، جب خیمہ لگا دیا جاتا تو اس میں داخل ہوتے اور کتابیں پھیلا دیتے، اور خادم دوسرے خیمہ صحیح کرنے لگتے، وہ پوری رات ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔''

شہید مکتبہ

اسلاف میں فنافی العلم بعض حضرات ایسے بھی گزرے ہیں جنہیں کتابوں سے عشق تھا، جن کی زندگی کتابوں کے گلستان میں گزرتی تھی، اور ان کے نزدیک کتابیں دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھیں۔ ایسی جلیل القدر ہستیوں میں سے ایک مشہور و معروف عربی دان عمر بن بحر المعروف علامہ جاحظ تھے۔ ان کے بعض عقائد و نظریات وغیرہ سے اختلاف کے باوجود اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ کتابوں کے سچے عاشق تھے، اور کتابیں حاصل کرنے کا ادنیٰ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، جاحظ کی کتابوں سے محبت کے بارے میں ایک عینی گواہ ابو ہفان (ت:۲۵۷ھ) کہتے ہیں:

''لم ارقط ولا سمعت من احب الکتب والعلوم اکثر من الجاحظ، فانه لم یقع بیده کتاب قط الا استوفی قرائته کائنا ما کان، حتی انه کان یکتری دکاکین الوراقین ویبیت فیها للنظر۔''

ترجمہ: ''میں ایسا کوئی شخص نہ کبھی دیکھا اور نہ سنا جس کو جاحظ سے بڑھ کر کتابوں اور علم سے محبت ہو، کیونکہ علامہ جاحظ کے ہاتھ میں جب بھی کوئی کتاب آتی تو اس کا پورا مطالعہ کرتے، چاہے جیسی بھی کتاب ہو، یہاں تک کہ وہ کتب فروشوں کی دکانیں کرائے پر لیتے، اور اس میں مطالعہ کے لیے رات کو ٹھہرتے۔''

جاحظ کو کتابوں سے اس قدر الفت و محبت تھی کہ ہر لکھی ہوئی چیز کا مطالعہ کرتے، یہاں تک کہ لکھے ہوئے کاغذات بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ مشہور ہے، جسے محمد بن سلیمان جوہری بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم جاحظ کے ساتھ

سیر و تفریح کی غرض سے نکلے، ابھی ہم بصرہ کی جامع مسجد کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ ایک خاتون نے کچھ پھٹے ہوئے اوراق برائے فروخت ہمارے سامنے پیش کیے، چونکہ ان میں ہمیں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا، اس لیے ہم انہیں چھوڑ کر آگے چلے، لیکن جاحظ اس عورت کے ساتھ پیچھے رہ گیا، ہم نے کافی انتظار کے بعد دیکھا کہ اس نے اس عورت کو قیمت دی اور وہ اوراق لیے، اور ہمیں انتظار کا کہہ کر اپنے گھر چلا گیا، پھر جب وہ لوٹا تو ہم اس کا مذاق اُڑانے لگے، اس پر اس نے کہا: فنرت بقطعته من العلم وافرة'' یعنی میں علم کا ایک کامل حصہ لے کر کامیاب ہو گیا ہوں، یہ جواب سن کر ہم ہنسنے لگے، تو اس نے کہا:

''انتم حمقی، والله ان فیها ما لا یوجد الا فیها، ولکنکم جهال، لا تعرفون النفیس من الخسیس۔''

ترجمہ: ''تم بے وقوف ہو بخدا! ان اوراق میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو صرف انہیں میں پائی جاتی ہیں، لیکن تم ناواقف ہو، قیمتی چیز کو خسیس و گھٹیا چیز سے جدا نہیں کر سکتے۔''

نیز جاحظ کی کتابوں سے محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا انتقال بھی کتابوں کے درمیان ہوا، اور جس وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر رہی تھی، اس وقت بھی کتابیں ان کے سینے پر تھیں، اور یوں وہ شہید مکتبہ کہلائے، چنانچہ علامہ ابن العماد حنبلی (ت:۱۰۸۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''وکان موته بسقوط مجلدات العلم علیه۔''

یعنی ''ان کا انتقال کتابوں کے اُن پر گرنے کی وجہ سے ہوا۔''

اور علامہ زرکلی رقم طراز ہیں:

''ومات والکتاب علی صدره قتلته مجلدات من الکتب وقعت علیه۔''

ترجمہ: ان کی وفات اس حال میں ہوئی کہ کتاب ان کی سینے پر تھی، اس پر گرنے والی کتابوں کی جلدوں نے انہیں قتل کر ڈالا تھا۔''

ایک کتاب کے لیے میدان عرفات میں منادی کرانا

ہمارے اسلاف اور بزرگوں میں سے کتاب دوست بعض ایسے بھی گزرے ہیں جو مطلوبہ ایک کتاب کے حصول کے لیے بھی سرگرداں رہتے تھے، اور حتی المقدور اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے، انہی شخصیتوں میں سے ایک ابو بکر ابن اخشاد ہیں، وہ کہتے ہیں کہ علامہ جاحظ نے اپنی تالیف ''کتاب الحیوان'' کے شروع میں اپنی تمام تالیفات کا ذکر کیا تھا، من جملہ ان میں دو کتابوں ''الفرق بین النبی والمتنبی'' اور ''کتاب دلائل النبوۃ'' کا نام بھی تھا، کوشش کے بعد ''کتاب دلائل النبوۃ تو مل گئی، لیکن دوسری کتاب نہ مل سکی، پھر خیال ہوا کہ کہیں غلطی سے دوسری کتاب کا نام نہ لکھ دیا گیا ہو، اور حقیقت میں ایک ہی کتاب ہو، بہر حال جب میں مصر سے مکہ مکرمہ حج کرنے آیا تو میں نے میدان عرفات میں منادی کرائی، کیونکہ اطراف عالم سے لوگ وہاں آئے ہوئے تھے، اور اعلان کے الفاظ حسب ذیل تھے:

''رحم الله من دلنا علی کتاب الفرق بین النبی والمتنهیء لابی عثمان الجاحظ علی ای وجه کان۔''

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کسی بھی طرح ابو عثمان جاحظ کی کتاب **''الفرق بین النبی والمتنبی''** کی طرف رہنمائی کرے۔''

اعلان کرنے والا میدان عرفات کا چکر لگاتا رہا، اور بالآخر ابن اخشاد کے پاس ناکام لوٹا، اور بتایا کہ لوگوں کو اس کتاب کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی کا کتابوں میں استغراق

امام محمد اپنا اکثر وقت گلستان کتب میں گزارتے، اور گھر کو بھی ایک قسم کا کتب خانہ بنا دیا تھا، وہ کتابوں کے درمیان گھرے رہتے، اور ہمہ وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے نواسے نے والدہ محترمہ یعنی امام محمد کی لخت جگر سے پوچھا کہ امی! بتلایئے کہ ناناجان اپنے گھر میں کیا کرتے تھے؟ اس پر ان والدہ نے جواب دیا:

''کان والله یا بنی! یکون فی هذا البیت وحوله الکتب، ما کنت اسمع له کلمته غیر انی کنت اراه یشیر بحاجبه واصبعه۔''

ترجمہ: '' اللہ کی قسم! اے میرے بیٹے! وہ اس گھر میں ہوتے تھے، چاروں طرف کتابیں رکھی ہوتی تھیں، میں انہیں باتیں کرتے ہوئے نہیں سنتی تھی، بوقت ضرورت بھووں یا ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے۔''

گھر فروخت کرکے کتابیں خریدنا

دنیا میں بعض شخصیات کتاب سے محبت کرنے والی ایسی گزری ہیں، جنہوں نے کتابیں پانے کے لیے اپنا گھر بیچ ڈالا۔ بالفاظ دیگر جسمانی سکون وآرام کے اسباب کے بدلے ذہنی راحت وسرور خریدا، اور کتابوں کے عاشقوں کے سامنے یہ سستا سودا ہے۔ انہی ہستیوں میں سے ایک ابو العلاء حسن بن احمد ہمدانی (ت:۵۶۹) ہیں۔ چنانچہ طلحہ بن مظفر علی (ت: ۵۹۳) کا بیان ہے:

''بیعت کتب ابن الجوالیقی فی بغداد، فحضرها اولحافظ ابو العلاء الهمدانی، فنادوا علی قطعته منها: ستین دینارا، فاشتراها الحافظ ابو العلاء بستین دینارا، والانظار من یوم الخمیس الی یوم الخمیس فخرج الحافظ، واستقبل طریق همدان، فوصل فنادی علی دار له، فبلغت ستین دینارا فقال: بیعوا قالوا: تبلغ اکثر من ذالک قال: بیعوا فباعوا الدار بستین دینارا فقبضها، ثم رجع الی بغداد، فدخلها یوم الخمیس، فوق ثمن الکتب۔''

ترجمہ: ''ایک مرتبہ بغداد میں ابن جوالیقی کی کتابیں فروخت کی جارہی تھیں، حافظ ابو العلاء ہمدانی بھی وہاں پہنچ گئے، فروخت کنندہ نے ان میں سے کچھ کتابوں کی قیمت ساٹھ دینار بتائی، ابو العلاء ہمدانی نے انہیں ساٹھ دینار میں خریدا، ایک جمعرات سے دوسری جمعرات تک مہلت تھی، حافظ ابو العلاء نے ہمدان کا راستہ لیا، وہاں پہنچ کر اپنا گھر بیچنے کا اعلان کرایا، جب اس کی قیمت ساٹھ دینار تک پہنچی تو انہوں نے لوگوں سے فرمایا کہ فروخت کردو، لوگوں نے

کہا کہ اس سے زیادہ لگ سکتی ہے، لیکن پھر بھی انہوں نے بیچنے کا کہا، تو انہوں نے ساٹھ ہزار میں گھر فروخت کر دیا، ابوالعلاء ہمدانی نے قیمت پر قبضہ کر کے بغداد کی راہ لی، اور جمعرات کو وہاں پہنچے، اور کتابوں کی قیمت ادا کر دی۔''

کتابیں بمنزلہ سوکن

کتب بینی کی لذت ایسی ہے کہ انسان دنیا ومافیہا سے بے گانہ ہو جاتا ہے، اور کتابوں کے سوا اس کو کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ بعض سلف صالحین کی بیویاں کتابوں کو سوکن شمار کرتی تھیں کہ جس طرح سوکن کی وجہ سے مرد کی توجہ بٹ جاتی ہے، اور بیوی کی طرف نظر التفات میں کمی آجاتی ہے، اسی طرح کتابوں کی وجہ سے بھی بسا اوقات اہلیہ اور گھر بار کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے، چنانچہ مشہور محدث زبیر بن بکار کی زوجہ محترمہ بھی کتابوں کو اپنے حق میں تین سوکنوں سے زیادہ مضر کہتی تھیں، جیسا کہ زبیر بن بکار خود فرماتے ہیں:

''قالت ابنته لاخی لاهلنا: خالی خیر رجل لاهله لا یتخذ ضرة ولایشتری جاریته قال: تقول المراة: والله هذه الکتب اشد علی من ثلاث ضرائر۔''

ترجمہ: میری بھانجی نے میری اہلیہ سے کہا: میرا ماموں اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہے کہ دوسری شادی کر کے کوئی سوکن نہیں لاتا، اور باندی بھی نہیں خریدتا، اس پر اہلیہ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔''

نیز مشہور ومعروف فقیہ ومحدث امام ابو بکر محمد بن مسلم الزہری کے بارے میں بھی سوانح نگاروں نے یہی بات کی ہے کہ کتابیں دیکھ کر آپ دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہو جاتے تھے، اسی وجہ سے ان کی اہلیہ کتابوں کو سوکن کہتی تھیں، جیسا کہ امام زہری (ت:۱۲۴ھ) کے بارے میں علامہ ابن خلکان (ت:۶۸۱ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''وکان اذا جلس فی بیته وضع کتبه حوله فیشتغل بها عن کل شیء من امور الدنیا فقالت له امراته یوما: واللّٰه هذاه الکتب اشد علی من ثلاث ضرائر۔''

ترجمہ: ''امام زہری جب گھر میں بیٹھتے تو اپنے ارد گرد کتابیں رکھتے، اور پھر ان میں مشغول ہو کر تمام دنیاوی معاملات بھول جاتے، اسی وجہ سے ایک دن ان کی اہلیہ نے ان سے کہا: اللہ کی قسم! یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔''

خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف واکابرین کتب بینی کا مشغلہ رکھنے والے اور کتاب دوست تھے، ان کو فرد ومعاشرہ کی اصلاح کے سلسلے میں کتاب کی اہمیت کا اندازہ تھا، وہ سماج وثقافت پر اس کے دیرپا نتائج سے بھی بخوبی واقف تھے، وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کتاب جیسا بے ضرر اور فائدہ مند دوست اور کوئی نہیں، اور کتاب حصول علم کا سب سے عمدہ ذریعہ ہے، اسی وجہ سے انہوں نے کتاب دوستی کی ایسی ناقابل فراموش داستان رقم کی ہے کہ موجودہ دور میں اس کا عشر عشیر ملنا بھی مشکل ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے اسلاف کی نقش قدم پر چلتے ہوئے کتاب دوستی کی روایت کو باقی رکھیں۔

مفتی محمد طارق محمود

اسلاف واکابر کی تواضع کے واقعات

ہمارے اکابر علمی اور عملی کمالات کے جامع تھے۔ ان حضرات کے کمالات میں ایک نمایاں وصف تواضع تھا۔ تواضع کا مقابل تکبر ہے، تکبر ایسا گناہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ تمام گناہوں کی جڑ یہی ہے۔ ابلیس کی علت یہی انانیت تھی۔ تکبر کہتے ہیں کسی دینی یا دنیاوی کمال میں اپنے آپ کو اپنے اختیار سے دوسرے سے اس طرح بڑا سمجھنا کہ دوسرے کی حقارت دل میں آئے، یا غصے کی حالت میں حق کی نصیحت کی جائے تو اُسے رد کرے۔ اگر اپنے کسی کمال کا خیال آئے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ میرا ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ جب چاہیں اسے چھین لیں، اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے میں کوئی ایسا کمال ہو جس کی وجہ سے اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مجھ سے زیادہ ہو۔

تواضع کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کی اپنے سے نفی کرے، بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان کو اپنے کمال سے نہ سمجھے، بلکہ محض فضل ورحمت سمجھے۔

اس مضمون میں اپنے مشائخ دیوبند کی تواضع کے متفرق واقعات نقل کیے جارہے ہیں:

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۲۳۳ـ۱۳۱۷) قدس سرہ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات تمام تمام رات اس ایک شعر کو پڑھ پڑھ کر روتے روتے گزار دیتے تھے:

اے خدا! ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم ہم سر من پیدا مکن

''اے خدا اس بندہ کو رسوا نہ کرنا، اگر برا ہوں تو بھی میرا راز ظاہر نہ کرنا۔''

ایک خط میں (اپنے مرید) حضرت گنگوہی کو تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تم عزیزوں کے کمالات کی وجہ سے فقیر (حضرت حاجی امداد اللہ) کے نقصان وعیوب چھپ گئے ہیں۔ وہ تمہاری محبت نے اکسیر کا کام کیا ہے۔ انشاء اللہ! قیامت میں بھی ایسی ہی پردہ پوشی کی امید ہے، وہ تمہاری محبت کا بڑا وسیلہ ہے۔''

کچھ حد ہے اس تواضع کی! ایک دفعہ حضرت کے خدام کا قافلہ جدہ سے مکہ خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے باوجود بڑھاپے اور کمزوری کے باب مکہ پر آکر ان کا استقبال کیا۔ ہر ایک سے بغل گیر ہوئے اور ہنس ہنس کر حال دریافت فرمایا، چاہے اجنبی ہو یا واقف۔ اپنے مکان پر لاکر سب کو ٹھہرایا اور صبح کھانے کی دعوت سب کی حضرت کے دستر خوان پر ہوئی۔ شفقت وتواضع وتحمل جس درجہ اس واقعہ سے ظاہر ہے محتاج بیاں نہیں۔

حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک شخص آئے اور عرض کیا کہ ایسا وظیفہ بتلا دیجیے گا کہ خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ: آپ کو بڑا حوصلہ ہے! ہم تو اس قابل بھی نہیں کہ روضۂ مبارک کے گنبد شریف ہی کی زیارت نصیب ہو جائے۔ اللہ اکبر! کس قدر شکستگی وتواضع کا غلبہ تھا۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۴۴ـ۱۳۲۳ھ) قدس سرہ

میں (مولانا اشرف علی تھانوی) جب عازم سفر حجاز ہوا تو ایک بار حاضری کے بعد عریضے کے ذریعے سے حضرت قدس اللہ سرہ کی خدمت میں اپنی تیاری سفر کی اطلاع کی۔ حضرت کا جو جواب آیا، اس میں لکھا تھا کہ وہاں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچ کر مجھ کو بھی یاد رکھنا، اور یہ شعر تحریر فرمایا:

چوں باحبیب نشینی وبادہ پیمائی
بہ یاد آر حریفاں بادہ پیما را

''جب دوست کے ساتھ بیٹھ کر جام پیو تو اپنے حریفوں کو بھی یاد کرنا''۔

اس سے حضرت قدس اللہ سرہ کا کمال تواضع ظاہر ہے کہ ایسے نااہل سے ایسی فرمائش! یہ قصہ بعینہ مشابہ اس کے ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے اجازت عمرے کی مانگی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے میرے بھائی! ہم کو بھی دعا میں شریک کرنا، بھولنامت۔ پس تواضع کے ساتھ کمال اتباع سنت بھی اس قصے سے ثابت ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی ایک مرتبہ حدیث پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی، سب طلبہ کتابیں لے لے کر اندر بھاگے، مگر مولانا سب طلبہ کی جوتیاں جمع کر رہے تھے کہ اُٹھا کر لے چلیں! لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے۔

حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸۔۱۲۹۷ھ) قدس سرہ

حضرت مولانا قاسم صاحب جس طالب علم کے اندر تکبر دیکھتے تھے، اس سے کبھی کبھی جوتے اُٹھوایا کرتے تھے، اور جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے، اس کے جوتے خود اُٹھالیا کرتے تھے۔

مولانا نانوتوی سفر حج میں تھے، اس سفر میں ان کا جہاز یمن کی ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا، اور مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند دن قیام کرے گا، چونکہ آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب بستی میں ایک بہت معمر عالم اور محدث رہتے ہیں، اس لیے آپ جہاز سے اُتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔ انہوں نے حضرت کے اساتذہ کا سلسلہ دریافت فرما کر سند حدیث دے دی۔ باوجود کامل ہونے کے دوسرے اہل کمال سے استفادہ فرمانا کمال تواضع اور حرص دین کی دلیل ہے۔

حضرت نانوتوی علماء کی وضع عمامہ کرتہ کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں (مولانا محمد

یعقوب نانوتوی) کہتا ہوں، اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا؟ جو کمالات تھے، وہ کس قدر تھے؟ کیا اس میں سے ظاہر ہوئے؟ آخر سب کو خاک میں ہی ملادیا، اپنا کہنا کر دکھایا۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۲۴۹۔۱۳۰۲ھ) قدس سرہ

مولانا محمد یعقوب صاحب کتنے بڑے عالم تھے، لیکن درس میں اگر کسی ادنیٰ طالب علم نے بھی مولانا کے خلاف تقریر کر دی اور وہ جی کو لگ گئی تو فوراً مان لیتے تھے، اور صاف الفاظ میں فرماتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پھر دو چار سیکنڈ کے بعد فرماتے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، یہاں تک کہ مخاطب خود شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اور جہاں کوئی شبہ ہوتا تو فرمایا کرتے تھے کہ میرا ذہن جہاں تک پہنچ سکتا ہے، اول ہی مرتبہ پہنچ جاتا ہے، پھر نہیں پہنچتا۔ پھر جہاں شبہ رہتا صاف فرمادیتے: مجھے اس مقام میں شرح صدر نہیں۔ اور کتاب لے کر کسی ماتحت مدرس کے پاس جاتے۔ (مولانا خود صدر مدرس تھے، باقی سب ماتحت ہی تھے) اور شاگردوں کی جگہ بیٹھ کر پوچھتے۔ وہ بھی مزاج سے واقف تھے، نہ اُٹھتے نہ صدر پر بیٹھنے کو عرض کرتے اور وہاں سے آکر صاف فرمادیتے کہ میں نے ان مولوی صاحب سے پوچھا ہے، انہوں نے یہ مطلب بتایا ہے! اہل اللہ میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس میں حضرت کی تواضع کے کئی واقعات آگئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۲۶۸۔۱۳۳۹ھ) قدس سرہ

حضرت اپنے تلامذہ کے ساتھ اس طرح اختلاط وارتباط وانبساط رکھتے کہ دیکھنے والا کبھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اس مجمع کے مخدوم ہیں۔

کسی سے کسی خدمت کی فرمائش کرنے کی عادت نہ تھی، بلکہ اکثر مہمانوں کی لیے کھانا مکان سے اپنی ہاتھ میں لاتے اور خود کھلاتے۔

حضرت مولانا (شیخ الہند) نے ارشاد فرمایا کہ بارہا گنگوہ کی حاضری کے وقت خیال ہوا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے حدیث کی اجازت کی درخواست کروں، مگر معاً ہی یہ خیال مانع آگیا کہ اگر حضرت پوچھ بیٹھیں: تجھ کو آتا ہی کیا ہے جو حدیث کی سند مانگتا ہے؟ تو کیا جواب دوں گا؟ بس یہ سوچ کر رہ گیا۔ اللہ اکبر! کچھ حد ہے تواضع کی؟!

مدرسہ عالیہ دیوبند میں اہل علم کا ایک خاص جلسہ تھا، جس میں اس پر کلام ہو رہا تھا کہ آج کل طلبہ اکثر بداستعداد کیوں ہوتے ہیں؟ اور سب متفقاً اس کا سبب طلبہ کی کوتاہیوں کو بتلا رہے تھے، مثلاً مطالعہ نہ دیکھنا، سمجھ کر نہ پڑھنا، اپنے رائے سے سبق شروع کر دینا، سبق چھوڑ دینا، وغیرہ۔ ایک صاحب جو کسی مدرسے میں مدرس تھے اور حضرت مولانا کے شاگرد بھی تھے اور طبعاً ذرا دلیر بھی تھے، بے ساختہ بول اُٹھے کہ کیوں حضرات! سب طلبہ ہی پر الزام ہے، مدرسین کی کوئی خطا نہیں؟ حضرت مولانا نے فرمایا: ہاں بھئی! وہ تم بتلاؤ۔ وہ بولے: کیا یہ مدرسین کی غلطی نہیں ہے کہ کسی طالب علم نے کوئی بات پوچھی، بجائے اس کے کہ شفقت سے اس کا شبہ رفع کریں، جھاڑ کی طرح اس کے پیچھے لگ گئے اور الزامی جوابوں سے اس کے سر ہو گئے، وہ بے چارہ خوف زدہ ہو کر چپ رہ گیا اور وہ شبہ جوں کا توں رہ گیا، تو اس فن میں کیا استعداد ہو؟ تو مولانا کیا فرماتے ہیں: ہاں بھائی ہاں! سچ کہتے ہو، یہ عیب تو میرے اندر بھی ہے، وہ بے چارے بے حد شرمندہ ہوئے کہ حضرت! واللہ جو میرا یہ مقصود ہو، نعوذ باللہ! حضرت کو تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ ہنس کر فرمانے لگے: تم نہ کہو، مجھ کو تو معلوم ہے، میں تو کہتا ہوں۔

قدوۃ العلما حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۲۶۹۔۱۳۴۶ھ) قدس سرہ

مولانا (خلیل احمد سہارنپوری) میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل واشکالات علمیہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ فرماتے تھے اور چھوٹوں کی باتوں کی شرح صدر کے بعد قبول فرما لیتے تھے، چنانچہ بعض واقعات نمونے کے طور پر پیش ہیں:

ایک بار سفر بہاولپور میں اس احقر (حضرت تھانوی) سے ارشاد فرمایا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول ہدایا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے سے اشراف نفس نہ ہو، مگر سفر میں اکثر داعی کی عادت ہوتی ہے کہ مدعو کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں، اس عادت کے سبب اکثر خیال بھی ایسے ہدایا کا ذہن میں آجاتا ہے، سو کیا خیال آنا بھی اشراف نفس وانتظار میں داخل ہے، جس کے بعد ہدیہ لینا خلاف سنت ہے؟ اس حقیر میں کیا قابلیت تھی کہ ایسے عظیم الشان عالم اور عارف کے سوال کا جواب دے سکوں، لیکن چونکہ پوچھنے کے انداز سے جواب دینے کا حکم معلوم ہوتا تھا، اس لیے جواب عرض کرنا ضروری تھا، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اس احتمال کے بعد دیکھا جائے کہ اگر ہدیہ نہ ملے تو آیا جی میں کچھ ناگواری پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ناگواری ہو تو یہ خیال آنا اشراف نفس ہے اور اگر ناگواری نہ ہو تو اشراف نفس نہیں ہے۔ اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور دعا دی۔

اس واقعے میں مولانا کے چند کمالات ثابت ہوتے ہیں: ایک تواضع جس کے سلسلے میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے دقیق تقویٰ کہ اشراف کے احتمال بعید تک نظر پہنچی اور اس پر عمل کا اہتمام ہوا۔ تیسرے اتباع سنت، جیسا کہ ظاہر ہے۔ چوتھے اپنے معاملے میں اپنی رائے پر اعتماد نہیں کیا، ورنہ جس کی نظر اتنی دقیق ہو، کیا اس فیصلے تک وہ نظر نہیں پہنچ سکتی تھی؟

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰۔۱۳۶۲ھ) قدس سرہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''ہمارے سب بزرگوں کی امتیازی شان تواضع اور فروتنی تھی۔ (علم وعمل میں بڑے بڑوں سے ممتاز ہونے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے تھے) اور فرمایا کہ: میں الحمدللہ! کسی کو بھی اپنے دل سے چھوٹا نہیں سمجھتا، کیونکہ میں ہر فاسق میں حالاً اور ہر کافر میں مآلاً یہ احتمال سمجھتا ہوں کہ شاید وہ عنداللہ اس زمانے کے مشائخ واولیاء سے افضل وبہتر ہو۔''

فرمایا حضرت والا نے: مجھے واللہ! کبھی وسوسہ بھی نہیں آتا کہ مجھے کچھ آتا ہے، اور کوئی فن بھی آتا ہے۔ میں طالب علموں کو بھی اپنے سامنے زیادہ سمجھتا ہوں۔ وعظ کہنے بیٹھتا ہوں تو یہ خیال رہتا ہے کہ کوئی بات غلط نہ بیان ہو جائے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں محض بلا تصنع کہتا ہوں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خدمت دین کی مجھ سے ہو سکے اس کی توفیق دے، اور اسی میں عمر ختم ہو جائے۔

حضرت نے فرمایا: جس طرح میں دوسروں کی اصلاح کے طرق سوچتا رہتا ہوں، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اپنی اصلاح کے طریق بھی سوچتا رہتا ہوں۔ مسلمان کو تو مرتے دم تک اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہنا چاہیے۔ اس پر بھی اگر نجات ہو جائے تو سب کچھ ہے۔ اس سے آگے ہم کیا حوصلہ اور ہمت کر سکتے ہیں؟ باقی فضائل و مدارج تو بڑے لوگوں کی باتیں ہیں، ہم کو تو جنتیوں کی جوتیوں ہی میں جگہ مل جائے، یہ ہی بڑی دولت ہے۔

جونپور میں وعظ سے پہلے حضرت کی خدمت میں ایک بے ہودہ خط پہنچا، اس میں چار باتیں لکھی تھیں: ایک یہ کہ تم جولاہے ہو، دوسری یہ کہ جاہل ہو، تیسری یہ کہ کافر ہو، چوتھی یہ کہ سنبھل کر بولنا حضرت نے وعظ سے پہلے مجمع میں خط پڑھ کر سنایا اور چاروں باتوں کا انتہائی تواضع، نرمی اور صفائی سے جواب دیا۔

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری (۱۲۹۲۔۱۳۵۲ھ) قدس سرہ

حضرت کا ارشاد ہے: میں نے سات سال کی عمر کے بعد دین کی کسی کتاب کو بغیر وضو کے ہاتھ نہیں لگایا، اور مطالعہ کے دوران کبھی کتاب کو اپنے تابع نہیں کیا۔ اگر کتاب میرے سامنے رکھی ہوئی ہے اور حاشیہ دوسری جانب ہے تو ایسی کبھی نوبت نہیں آئی کہ حاشیہ کی جانب کو گھما کر اپنے سامنے کر لیا، بلکہ اُٹھ کر اس جانب جا بیٹھا ہوں جدھر حاشیہ ہوتا۔

جب مجلس علمی ڈابھیل قائم ہوئی اور حضرت شاہ صاحب کی بعض تالیفات طباعت کے لیے منتخب کی گئیں، جن کے سرورق پر حسب دستور تعظیمی القاب کے اضافے کیے گئے۔ حضرت نے اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ صرف محمد انور شاہ الکشمیری لکھیے، یا

زیادہ سے زیادہ الاستاذ محمد انور شاہ الکشمیری لکھیے، چنانچہ آپ کی تمام تر وہ مطبوعات جنہیں مجلس علمی نے شائع کیا ہے، اسی نام و عنوان کے ساتھ شائع کی گئیں۔

حضرت فرماتے ہیں: میں ڈابھیل کے سفر کے لیے پابہ رکاب تھا، اسی دوران جامعہ عباسیہ کے شیخ کا تار ملا کہ اس مقدمہ (بہاولپور) میں تیری شہادت مطلوب ہے۔ میں نے سوچا میں ایک بے عمل شخص ہوں، جس کا دامن زادِ آخرت سے خالی ہے۔ شاید مجھ روسیاہ کی نجات کے لیے یہی چیز کار آمد ہو کہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے دین کی حمایت کے لیے آیا ہوں اور ختم نبوت کی جانبداری میرے لیے ذریعۂ نجات میں جائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۲۹۶۔۱۳۷۷ھ) قدس سرہ:

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری (متوفی: ۱۳۸۱ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یوپی میں میری تقریر تھی۔ رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا۔ بیداری اور نیند کے درمیان مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں نے کہا: خیر مجھے عادت بھی ہے، کوئی دوست ہوگا، مگر اسی کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے۔ باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی ہے، سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں۔ فوراً پھڑک کر چارپائی سے اُتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا: حضرت! کیا ہم نے اپنے لیے جہنم جانے کا خود سامان پہلے سے کم کر رکھا ہے کہ آپ بھی ہمیں دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں؟ شیخ نے جواباً فرمایا: آپ نے دیر تک تقریر کی تھی، آرام کی ضرورت تھی، اور آپ کی عادت بھی تھی، اور مجھ کو سعادت کی ضرورت! ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا، میں نے خیال کیا آپ کی نماز چلی نہ جائے! تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی؟ حضرت مدنی اپنے نام کے ساتھ غایت تواضع سے ننگ اسلاف لکھا کرتے تھے، اس کے معنی ہیں جو اپنے بڑوں کے لیے عار کا باعث ہو!

ایک مرتبہ کھتولی میں تبلیغی اجتماع تھا، جس میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۶۳ھ) تشریف لائے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی، اچانک پتہ چلا کہ قریب کانگریس کا جلسہ ہے، جہاں حضرت مدنی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مولانا

الیاس صاحب نے تقریر بند کر دی اور فرمایا کہ قریب حضرت مدنی تشریف لائے ہوئے ہیں، سب حضرات چل کر ان کی تقریر سنیں۔ وہاں حضرت مدنی کو پتہ چلا کہ قریب میں تبلیغی جلسہ ہے، اور مولانا الیاس صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنی تقریر ختم کر دی، اور لوگوں کو تبلیغی جلسے میں شرکت کی ہدایت فرما کر دیوبند روانہ ہو گئے، جلسہ نہ یہاں ہوا اور نہ وہاں!

اس واقعے سے دونوں بزرگوں کی تواضع اور اخلاص اظہر من الشمس ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳۰۵-۱۳۶۹ھ) قدس سرہ

حضرت عثمانی حضرت مدنی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: ''بعض مقامات پر جو ناشائستہ برتاؤ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ کیا گیا ہے تو میں اس پر اظہار بیزاری کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط ہو، ان کا علم و فضل بہر حال مسلم ہے، اور اپنے نصب العین کے لیے ان کی عزیمت اور ہمت اور انتھک جد وجہد ہم جیسے کاہلوں کے لیے قابل عبرت ہے۔ سیاسی اختلاف رائے کے باوجود حضرت مدنی کا اور اپنا تذکرہ جس انداز سے فرمایا گیا ہے وہ کمال تواضع کی کھلی دلیل ہے۔

اکابر دیوبند کے کمالات کا ذکر فرما کر حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۹۶ھ) فرمایا کرتے تھے کہ: میں نے ایک مصرع کہا ہے، جس کا مصرع ثانی اب تک کوئی نہ کہہ سکا: '' ایک مجلس تھی فرشتوں کی جو برخواست ہوئی۔''

دس اکابر دیوبند کی تواضع کے کچھ واقعات عرض کیے گئے ہیں۔ اب اس شعر پر مضمون ختم کرتا ہوں''۔

احب الصالحین ولست منهم لعل الله یرزقنی صلاحا

''نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور خود نیک نہیں ہوں، شاید اس کی برکت اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا فرمائیں''۔

تحریر: ضمیر حسین لغاری

وحی یا عقل: اسلام اور لادینیت کا تصادم

مغرب میں مذہب (religion) اور علم (science) کو متضاد اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اہلِ مغرب کے نزدیک 'عقل' (Rationalism) اور 'علم' دونوں مذہب مخالف تصورات ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں مذہبی بات علمی نہیں ہو سکتی، اور جو بات علمی ہو وہ مذہبی نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک خالص سیکیولر رویہ ہے، اور سیکیولرازم (Secularism) کا مطلب ایسی لادین یا دنیاوی بات یا ایسا رویہ ہے، جس کا دین یا آخرت سے کوئی تعلق نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو تضاد پر مبنی ہو۔

سیکیولرازم کے دائرے میں ویسے تو خدا، رسالت، وحی اور آخرت کا مکمل انکار کیا جاتا ہے، لیکن اس نظریئے میں کچھ گنجائش بھی رکھی گئی ہے، یعنی اوپر بیان کئے گئے تصوراتِ مذہبی کا مکمل انکار ضروری نہیں۔

کوئی مسلمان یا عیسائی تمام خدائی تصورات کو مانتے ہوئے بھی 'سیکیولر' ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ تمام باتوں کو صرف ذاتی عقیدے تک محدود رکھے۔ یہاں تک کہ وہ مذہبی عبادات بھی کرتا رہے، لیکن اسے اپنی زندگی کے تمام عملی کام - شریعت، قانون، حکومت اور سیاست وغیرہ - غیر مذہبی قوتوں کے حوالے کرنا ہوں گے۔

سیکیولرازم اور الحاد کا فرق

یہاں سیکیولرازم اور الحاد (Atheism) کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ہر سیکیولر شخص 'ملحد' نہیں ہوتا، اور ہر ملحد سیکیولر بھی نہیں ہوتا۔

سیکیولرازم بے دینی اور لامذہبیت کی بات کرتا ہے۔اس نظریے کے مطابق دین و دنیا کے معاملات الگ الگ ہونے چاہئیں،اور کسی مذہب کو بھی اجتماعی انسانی معاملات (حکومت، سیاست، معیشت، تعلیم، ثقافت) میں دخل انداز نہیں ہونا چاہئے۔

الحاد (دہریت) یہ ہے کہ خدا،آسمانی کتابوں اور مابعد الطبعی ہستیوں کا کوئی وجود نہیں، لہٰذا انسان کے لیے کسی مذہبی قانون یا تعلیم کو ماننا ضروری نہیں۔ بلکہ انسان کو سائنس اور فطرت کی روشنی میں صحیح و غلط کا فیصلہ خود کرنا چاہئے،اور اپنے معیارات آپ وضع کرنے چاہیں۔

مادہ پرستی کیا ہے؟

یہاں لگے ہاتھوں مادہ پرستی (Materialism) یا مادیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔مادہ پرستی دراصل اسی الحادی سوچ کا دوسرا نام ہے۔اس نظریے کے مطابق صرف مادی اشیاء ہی حقیقت ہیں، باقی تمام غیر مادی اشیاء (روح، خدا، وحی وغیرہ) غیر حقیقی ہیں۔

جدید سائنس پر بھی اسی مادہ پرستی کا غلبہ ہے، جس کے زیر اثر سائنس بھی کہتی ہے کہ مادہ (matter) ہی اصل حقیقت ہے، باقی تمام اشیاء اوہام (superstitions) ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مادہ پرست سائنس ایک طرف وجودِ خدا کی منکر ہے، تو دوسری جانب خود ہی مادے کو 'خدا' کا درجہ دے کر اس سے خدائی صفات بھی منسوب کرتی ہے۔

اسلام سے تصادم کیوں؟

ایسی لامذہب سوچ اور نظریات کا اسلام سے ہر جگہ تصادم رہا ہے، کیونکہ اسلام صرف عقیدے کا نام نہیں بلکہ عقیدے اور شریعت دونوں پر مشتمل ہے۔

اسلام وحی، الہام اور خدائی ہدایت کی بات کرتا ہے، اور زندگی گزارنے کا ایک مکمل خدائی ضابطہ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام کے دائرے میں سیکیولر سوچ کی کوئی گنجائش نکل نہیں سکتی۔

سیکیولرازم کا اسلام سے ایک اور بڑا تصادم وجودِ خدا (Theology) کے حوالے سے ہے، دوسرا تصادم تخلیقِ انسان و کائنات کے مسئلے پر ہے، اور تیسرا علم اور خالص علم (Absolute Knowledge) کے ذرائع سے متعلق ہے۔

ان تمام شعبہ جات میں اسلام اور سیکیولرازم مختلف نظریات کے علمبردار ہیں۔ ہم یہاں صرف 'علم' کے میدان میں دونوں کے تصورات کا جائزہ لیں گے۔

'علم' کے میدان میں تصادم

اسلامی تصورِ علم خدا کی نازل کردہ 'وحی' کی بنیاد پر قائم ہے، جبکہ سیکیولرازم یا لادین مادہ پرستی (Secular Materialism) کا نظریہ 'شک' کی روایت پر مبنی ہے، اور 'شک' وحی کے مقابلے میں انسانی عقل کو استعمال کرنے کی بات کرتا ہے۔

آیئے پہلے تلاشِ علم کے معاملے میں 'عقل' کے استعمال کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی اس مقصد کے لیے عقل کا استعمال انسان کے بس میں ہے؟

عقل یعنی حواسِ خمسہ؟

اسلام کا تصورِ علم یہ ہے کہ "یقینی اور حقیقی علم کا سرچشمہ صرف وحیِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس حقیقی اور سچا علم ہے۔" جبکہ اس کے برعکس سیکیولر فکر کا دعوا ہے کہ "علم کا حتمی و حقیقی سرچشمہ انسان کی اپنی عقل ہے، جسے بروئے کار لانے کے بعد وہ کسی آسمانی ہدایت کا محتاج نہیں رہے گا۔"

سیکیولر نظریے کے مطابق انسانی علم کا دار و مدار صرف انسان کے حواسِ پنجگانہ (five senses) پر ہے، یعنی دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا۔ لہٰذا صرف انہی حواس سے تصدیق شدہ اشیاء و حقائق کو مانا جائے۔

چونکہ سائنسی تجربات و مشاہدات کا انحصار بھی انہی حواس پر ہے، لہٰذا الحاد اور سائنس کے پیروکار بھی صرف 'محسوس کی جانے والی دنیا' (observable world) کو ہی مانتے ہیں، اور ان تمام غیر مادی، فوق الفطرت (Supernatural) اور مابعد الطبعی (Meta-physical) ہستیوں یا تصورات کو رد کرتے ہیں جو ان پانچ حواس کی

دسترس سے باہر ہیں، جیسے خدا، فرشتے، جن، شیطان، روح، جنت، دوزخ، وحی، الہام اور معجزات وغیرہ۔

اس حقیقت سے بھی خود جدید سائنس ہی نے پردہ اٹھادیا ہے کہ پانچوں انسانی حواس مکمل نہیں ہیں، اور اس معاملے میں انسان کئی جانوروں سے بھی کم تر صلاحیت کا حامل ہے، کیونکہ بیشتر حیوانات کے حواس انسان سے کئی گنا تیز ہیں۔

لہٰذا ان پانچ حواس کے ذریعے حاصل شدہ محدود معلومات کو ھم حتمی سچائی (ultimate truth) نہیں مان کر سکتے۔

ان پانچ انسانی حواس کا تعلق صرف جسمانی وجود سے ہے، لیکن جیسا کہ انسان ایک روحانی وجود بھی ہے، اس لیے خدا نے اسے کئی روحانی اور غیر جسمانی (immaterial) حواس بھی عطا کیے ہیں۔ مثلاً محبت، خوف، امید، مسرت، مایوسی، خواب، غصہ، غم، یادداشت، ضمیر، احساس، ادراک، وجدان وغیرہ۔

ان کو کسی بھی مادی ذریعے سے ناپا تولا نہیں جا سکتا، صرف ان کا مشاہدہ کر کے عقل اور بصیرت (insight) کی بنیاد پر گواہی دی جا سکتی ہے کہ "ہاں یہ واقعی انسانی ہستی میں موجود ہیں۔"

اگرچہ سائنس 'چھٹی حس' (Sixth Sense) کو کسی حد تک مانتی ہے، لیکن اس کی بنیاد پر انسان کے روحانی وجود کی باضابطہ (Official) تصدیق نہیں کرتی۔

دوسری طرف پانچ ناقص و نامکمل حواس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ صرف دماغ تک معلومات کی رسائی کا کام کرتے ہیں، آگے نتیجہ نکالنا دماغ اور اس سے وابستہ روحانی حواس کا کام ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ روحانی حواس کے بغیر انسانی بقا ممکن ہی نہیں۔

یہی روحانی حواس انسان کو اخلاقی اور عقلی فیصلہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ انسان کو اَن دیکھی حقیقت محسوس کرنے اور مادی حدود سے باہر جھانکنے کی اہلیت دیتے ہیں۔ اگر انہیں سیکیولر معیار پر پرکھا جائے تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں، لیکن دراصل یہی انسان کی اصل شناخت ہیں۔

اِن حواس کو انسان کا سافٹ ویئر (software) اور انسانی جسم کو ہارڈویئر (hardware) قرار دیا جا سکتا ہے۔ سائنس کو قدیم انسانوں اور جانداروں کے پتھر بنے ہوئے ڈھانچوں (فوسلز) کے ذریعے ہارڈویئر تو ہاتھ آ گئے، لیکن وہ قدرت کے عطا کردہ سافٹ ویئر کو تاحال سمجھنے سے قاصر ہے، اس لئے تخلیقِ حیات و بشر کی ابتدا کے بارے میں صرف قیاس و گمان سے کام لیا جا رہا ہے۔

چونکہ جدید سائنس روح اور وحی کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی، اس لیے اس نے علمِ نفسیات (psychology) کو بھی سیکیولر سائیکالوجی بنا دیا ہے، جو 'نفس' کو بھی مادیت کے دائرے میں دیکھتی ہے، حالانکہ نفسیات روحانیت کا حصہ ہے۔

اسلام نے تو اس حوالے سے نفس کے سات درجات بتائے ہیں: نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ، نفسِ ملہمہ، نفسِ راضیہ، نفسِ مرضیہ اور نفسِ مطلقہ، لیکن سائنس ابھی تک اس معاملے میں بہت پیچھے ہے۔

عقل پرستی کی بنیاد کیا ہے؟

اب دیکھتے ہیں کہ عقل پرستی کی بنیاد آخر کس فلسفے پر ہے، اور یہ اسلام کی کن باتوں سے متصادم ہے۔

اسلام کی فکری روایت کی بنیاد اللہ تعالیٰ، اس کے پیغمبروں اور آخرت پر ایمان اور یقین پر ہے۔ اس کے برعکس مغربی سیکیولرازم اور عقل پرستی کی روایت 'شک' (Doubt) پر مبنی ہے، جس سے آگے چل کر خدا اور مذہب کے انکار نے جنم لیا۔ جدید مغربی فلسفہ 'شک' کو علم حاصل کرنے اور سچ تک پہنچنے کا اہم وسیلہ تصور کرتا ہے۔

رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes) جیسے مفکر کہتے ہیں "میں شک کرتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔"

(I think, therefore I am.) ۔

ڈیکارٹ نے کہا کہ "مجھے ہر چیز پر شک کرنا چاہیے، یہاں تک کہ میں کسی ایسی بات تک پہنچ جاؤں جس پر مزید شک نہ کیا جا سکے۔"

یہی خیال آگے چل کر سائنس، تنقیدی سوچ (critical thinking) اور فلسفے کے شعبہ جات میں 'شک کی روایت'(Tradition of Doubt) کی اساس بنا۔ اسی خیال کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ کسی بھی بات کو قبول کرنے سے پہلے اس پر شک کیا جائے، پھر تجربے کی بنیاد پر یقین قائم کیا جائے۔

'شک' کی پیروی کرنے والی عقل

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اور شک ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ کون کس کا پیروکار ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شک والی روایت ہی دراصل عقل پرستی کو بنیاد فراہم کرتی ہے، اور اعلان کرتی ہے کہ "عقل کو سوال اٹھانے کا حق حاصل ہے۔" یہی سوچ عقل پرستوں سے کہتی ہے کہ "شک کروگے تبھی تو سوچنا اور پرکھنا شروع کروگے۔"

اسی بنیاد پر سیکولر فکر کا کہنا ہے کہ "عقل اپنی آزادی سے خود فیصلہ کرے گی۔" دراصل ایسی بے لگام آزادی کی وجہ سے ہی عقل کو انکارِ وحی کی جرأت ملتی ہے۔

اسلام میں حقیقی علم اور سچ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وحی کے بیان کردہ حقائق پر ایمان لایا جائے، جبکہ مغرب میں علم کی راہ پر چلنے کی 'اہلیت' شک کرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔

اسی 'شک' کو اسلام روحانی بیماری قرار دیتا ہے۔ (**فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ**... سورۃ البقرۃ، آیت 10) اور کہتا ہے **ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** (یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ متقین کے لیے اس کتاب میں ہدایت ہے۔ البقرۃ، آیت 2)

تجربے سے حاصل شدہ 'یقین' کیا ہے؟

پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر 'تجربہ' کیا ہے۔

تجربے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ 'حق' اور 'سچ' کو پرکھنے کا ایک معیار تصور کیا جاتا ہے۔ اگر 'عقل' چاہے اور تسلیم کرے تو اس تجربے کے نتائج قبول کرتا ہے، ورنہ کسی بھی عظیم اور ازلی حقیقت کو یکسر مسترد کر دیتا ہے۔

ایسا 'تجربہ' انسانی معلومات میں اضافہ تو کرتا ہے، لیکن اس سے 'حق' اور 'سچ' حاصل نہیں ہوتا، اور انسان اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اسے 'علم' حاصل ہو گیا ہے، در حقیقت اسے صرف 'اطلاع' حاصل ہوتی ہے۔

اب ذرا غور کریں کہ اس تجربے سے پیدا ہونے والا 'یقین' کس قسم کا ہوتا ہے؟

لادین فکر کا یہ یقین اسلامی تصور والے یقین سے قطعی مختلف ہے۔ یہ وہ یقین ہے جو 'شک' کے بعد حاصل شدہ مادی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، جس کے نتائج آج اور تو کل کچھ اور ہو سکتے ہیں (جیسا کہ ہر نئی تحقیق کے بعد سائنسی نظریات اور دعوے بدل جاتے ہیں)۔ ایسے یقین کو 'ظنی' (گمان، امکان یا اندازے پر مبنی) یا عارضی کہا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب اسلامی تصور والا 'یقین' کسی تجربے کا محتاج نہیں۔ اس کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہے۔

اس یقین میں ابدیت (Eternity)، قطعیت (Certainty) اور الوہیت (Oneness) کے عناصر شامل ہیں۔ یعنی یہ ہمیشہ کے لیے اور ناقابلِ تغیر ہے، ہر شک وشبہے سے پاک ہے، اور اللہ کی ذات وصفات سے متصف ہے۔

مغربی سیکیولرازم ایمان کو 'ذہنی کمزوری'، 'عقلی نقص' اور 'نفسیاتی بیماری' کی علامت گردانتا ہے۔ جبکہ 'ایمان' کی قوت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ نہ صرف مادی حقائق آشکار کرتی ہے، بلکہ بنی آدم کے حقیر ذرء خاکی پر معنوی سچائی (spiritual and moral truth)، باطنی حقیقت، روحانی شعور اور اخروی آگاہی کے دروازے بھی کھولتی ہے۔

اسلام میں علم اور عقل کا مقام

سیکیولرازم میں حقیقت تک پہنچنے کا پہلا ذریعہ 'شک'، دوسرا 'عقل' اور تیسرا 'تجربہ' (یا مشاہدہ) ہے۔

اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔

اسلام کی نظر میں سچائی کا واحد سرچشمہ وحیءالٰہی (قرآن وحدیث) ہے۔ چنانچہ اسلام عقلِ انسانی کو وحی کا تابعِ فرمان بننے کی تلقین کرتا ہے، تاکہ یہ عقل خدائی ہدایت کی روشنی میں

زندگی کے تجربے اور مشاہدے (سائنس) سے استفادہ کرے۔ قرآن اسی دائرے میں عقل کے استعمال کی بار بار تلقین کرتا ہے۔

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔" (آل عمران،190)

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے اور اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں, جو سینوں میں ہیں۔" (الحج،46)

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔" (الروم،24)

اسلام عقل کے استعمال سے منع نہیں کرتا، عقل کو دشمنِ ایمان نہیں بلکہ ایمان کا ساتھی اور رہنما سمجھتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بس انسانی عقل وحی کے زیرِ اختیار ہو۔

اسلام انسانی عقل کو 'ایمان بالغیب' کا راستہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اگر اس کے بجائے عقل 'شک' یا 'بغاوت' سے کام لے گی تو کسی منزل تک نہیں پہنچ سکے گی۔

عقلِ انسانی کا معاملہ یہ ہے کہ 'ایمان بالغیب' کی راہ پر عاجزانہ سفر کے نتیجے میں ہی اسے 'یقین' کی دولت نصیب ہوتی ہے، جو قرآنی اصطلاح میں 'علم الیقین'، 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' کے درجات پر مشتمل ہے۔

جب الٰہی علم و حکمت کے سامنے عقلِ انسانی اپنی بے بسی کا اقرار کرکے سرِ تسلیم خم کرے گی، اپنی دانائی کا دائرہ محدود ہونے کا اعتراف کرے گی، اور اپنے اوپر خدائی رہنمائی کے اختیار کو تسلیم کرے گی، تبھی غیب کی سچائی پا سکے گی۔

آخری فیصلہ

وحی اور انسانی عقل، تلاشِ سچ کے دو مختلف راستے ہیں۔

ایک طرف ایمان و یقین کا راستہ ہے، جو ہزاروں سال کی نبوی ہدایت سے وابستہ و مزئین ہے، دوسری طرف 'شک' اور 'گمان' کی راہ ہے، جو جدید سیکیولر مغرب (امریکہ اور یورپ) کا فکری ورثہ ہے۔

دونوں راستے مختلف منازل کی طرف لے جاتے ہیں۔ دونوں کا تصادم انسان کے لیے علم، اخلاق اور روحانیت کے دائرے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے، لہٰذا فیصلہ انسان کے ہاتھ میں ہے، وحی یا عقل...!!!

محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

ہمارے کچھ اہم معاملات

احادیث نبوی کی روشنی میں

لوگوں کا شکریہ ادا نہ کرنے والا اللہ کا شکر ادا نہیں کر سکتا

فرمایا: جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا، لوگوں کے احسان کا شکریہ ادا کرنا اور اس کے لئے دعائے خیر کرنا بندہ مؤمن کی خاصیت ہے، جو ایسا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ (سنن ابی داود/کتاب داود/کتاب الأدب/حدیث: ۴۸۱۱)

لوگوں کی طرف سے احسان کا معاملہ کرنا، اگرچہ اللہ کی طرف سے ہے کہ اللہ نے اس کے دل میں بات ڈالی ہے، اس لئے لوگوں کے احسان کا شکریہ ادا کرنا ایک لحاظ سے اللہ کے شکر ادا کرنے کے برابر ہے۔

اللہ کی خاطر محبت کرنے والوں پر اللہ کی محبت کا واجب ہونا

فرمایا: (حدیث قدسی میں) اللہ فرماتا ہے کہ میری خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں، میری خاطر ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے والوں، میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرنے والوں اور میری خاطر ایک دوسرے کی مدد کرنے والوں پر میری محبت واجب ہو گئی۔ (مسند احمد: ۲۲۰۳۰) اس حدیث کو امام محمد نے روایت کیا ہے)۔

یہ حدیث شریف اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے، اللہ کے لئے عطا کرنے، اللہ کے لئے ملنے والوں اور اللہ کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرنے والوں کے لئے سب سے بڑی خوش خبری ہے کہ ایسے لوگوں سے اللہ محبت کرتا ہے، اور ظاہر ہے جس سے اللہ محبت کرے

اس کے لئے دین و دنیا کی ساری سعادتوں کے راستے کھل جاتے ہیں، اس میں اللہ کے محبت کے لئے مجلس سجانے میں شرکت کرنے والے افراد بھی آجاتے ہیں، اللہ کے لئے یہ کام سرانجام دینے والے افراد وہی ہوتے ہیں، جن کے اندر اللہ کی محبت کے اجزا موجود ہوتے ہیں، وہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے دلوں میں موجود طاقتور مثبت شعائیں منتقل ہوتی ہیں، جس سے ایک دوسرے کی ایمان و یقین کی حالت میں پختگی ہونے لگتی ہے اور وہ راہ محبت میں چلنے کے لئے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ اور نئی توانائی محسوس کرنے لگتے ہیں، نیز اللہ کے لئے ملتے رہنے سے اللہ کے لئے اعمال کرنے میں بھی آسانی پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ محبت ایک طاقتور عمل ہے، جو کمزور سے کمزور فرد کو بھی اٹھا کھڑا کر دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہ ہماری محرومی اور بد نصیبی ہے کہ موجودہ دور میں ہم اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے کے عمل کی اہمیت اور زندگی پر اُسکے پڑنے والے اس کے اثرات سے ناآشنا ہیں۔

دنیا میں سیکھنے کے دو ذرائع ہیں، ایک کتاب اور ذہن کا استعمال، دوسرے ماہر و تجربہ کار فرد (جسے استاد کہتے ہیں) اس کی صحبت، اسی طرح اللہ کی محبت کی دنیا میں چلنے کے لئے اللہ کی محبت سے سرشار فرد کی صحبت طاقتور عمل ہے، اس طرح کے فرد کے صحبت کی لئے آتے رہنے، ان سے رابطہ میں رہنے اور ان کے ساتھ محض اللہ کے لئے محبت کرنے اور اپنا دل ان کے حوالے کرنے سے دل پاکیزہ محبت کے جذبات سے لبریز ہونے لگتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں، ایسے افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی محبت ان پر واجب ہو گئی۔

اللہ کی محبت کے لئے مجلس میں شریک ہونے والا ہر فرد ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے، البتہ وہ افراد جن کے اندر محبت کے طاقتور اجزا موجود ہیں، وہ دوسروں پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، اور ان کی روحانیت سے دوسرے زیادہ مستفیض ہوتے ہیں، لیکن اس طرح کی مجلس میں شریک ہونے والے ہر فرد کو ایک دوسرے سے نفع ضرور ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں ہمارے حالات کے خراب ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مادی مفادات کے غلبے کی وجہ سے اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے ملنے کا عمل بُری طرح متاثر ہوا ہے،

جس کی وجہ سے دلوں میں پاکیزہ محبت کے جذبات موجزن ہونے کی بجائے دل تاریک ہونے لگتا ہے۔

اللہ کی خاطر محبت و نفرت سے ایمان کا کامل ہونا

فرمایا: جس نے اللہ کے لئے محبت کی، اللہ کے لئے نفرت کی، اللہ کی خاطر دیا، اللہ کی خاطر روک لیا تو اس نے ایمان کو مکمل کیا۔ (سنن ابی داؤد، جلد سوئم کتاب السنة ۴۶۸۱)

اس حدیث شریف سے مذکورہ حدیث شریف کی مزید تائید ہوتی ہے، اس حدیث شریف میں ایمان کی تکمیل کی صورت ہی یہی بتائی گئی ہے کہ اللہ کے لئے محبت کی جائے، اللہ کے لئے بغض رکھا جائے، اللہ کی خاطر عطا کیا جائے اور اللہ کی خاطر روک دیا جائے، جس شخص کی زندگی ان چیزوں کا نمونہ بن جائے، ایسے شخص کو کامل ایمان کی بشارت سنائی گئی۔

اس حدیث شریف میں اللہ کے لئے محبت کے ساتھ ساتھ بُرائی سے نفرت بھی شامل ہے، اگر بُرائی سے نفرت موجود نہیں ہے تو محبت کے باوجود اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ بُرائی کے اثرات کی زد میں نہ آجائے، بُرائی کی نفرت سے پہلے بُرائی کی نوعیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ موجودہ دور میں بُرائی اور فتنے خوبصورت شکل میں سامنے آئے ہیں، سیکولر نوعیت کی قیادت بھی بُرائی کی ایک شکل ہے، اس طرح کی قیادت سے تعلق خاطر رکھنا یہ اللہ کی محبت اور ایمان کی تکمیل کے منافی ہے، اسی طرح سوشل میڈیا پر مادیت پرستی پر مبنی مناظر و مباحث کو دیکھنا اور سنتے رہنا اور اسے معمول بنانا، یہ بھی ایسی چیز ہے جو فرد کو بُرائی میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، اس لئے بُرائی کی اس طرح کی ساری شکلوں سے نفرت کا ہونا ناگزیر ہے، ایمان کی تکمیل کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔